تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہ نامہ

# مفاہیم

کراچی

دسمبر ۲۰۲۲ء

جلد ۳

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۱

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

# ماہنامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار


سرپرستِ اعلی

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب

مدیر

صوفی جمیل الرحمن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسی بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی



فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# مضامین


| | | | |
|---|---|---|---|
| نعت | روک لیتی ہے آپ کی نسبت | خالد محمود خالدؔ | ۴ |
| اداریہ | اک برائی ہے تو بس یہ ہے کہ مرجاتے ہیں | مدیر | ۵ |
| درسِ قرآن | خرچ کرنے میں اعتدال | مولانا محمد اقبال | ۸ |
| درسِ حدیث | انبیاے کرام علیہم السلام کے جانشین | ابنِ عباس | ۱۴ |
| تنقیدِ مغرب | جامعہ بحریہ کے اساتذہ سے گفتگو (۲) | ڈاکٹر محمد رشید ارشد | ۱۶ |
| مقالات | جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (۲) | مولانا حماد احمد ترکؔ | ۲۲ |
| مقالات | حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ | مولانا زاہد الراشدی زید مجدہ | ۲۶ |
| مقالات | حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ | مولانا بدر الحسن القاسمی | ۲۹ |
| مقالات | بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۸) | صوفی جمیل الرحمان عباسی | ۳۶ |
| فقہیات | القواعد الفقهية: القاعدة السادسة | مفتی نذیر احمد ہاشمی | ۴۳ |
| بیسلوشنز | خریداری کے بدلے میں ملنے والے واؤچرز کا حکم | دارالافتاء، فقہ اکیڈمی | ۴۵ |
| رحلات | افغان نامہ (۵) | مفتی اویس پاشا قرنی | ۴۶ |

خالد محمود خالؔد (۱۹۴۱ء۔۲۰۱۸ء)
معروف نعت گو شاعر

# روک لیتی ہے آپ کی نسبت

روک لیتی ہے آپ کی نسبت، تیر جتنے بھی ہم پہ چلتے ہیں
یہ کرم ہے حضور کا ہم پر، آنے والے عذاب ٹلتے ہیں

اپنی اوقات صرف اتنی ہے، کچھ نہیں بات صرف اتنی ہے
کل بھی ٹکڑوں پہ ان کے پلتے تھے، اب بھی ٹکڑوں پہ ان کے پلتے ہیں

اب کوئی کیا ہمیں گرائے گا، ہر سہارا گلے لگائے گا
ہم نے خود کو گرا دیا ہے وہاں، گرنے والے جہاں سنبھلتے ہیں

ان کے دربار کے اجالے کی، رفعتیں ہیں بے نہاں خالؔد
یہ اجالے کبھی نہ سمٹیں گے، یہ وہ سورج نہیں جو ڈھلتے ہیں

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

****

مدیر
ماہنامہ مفاہیم، کراچی

# اک برائی ہے تو بس یہ ہے کہ مر جاتے ہیں

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دنیا سے کیا اٹھے سمجھو پورے جہاں کی موت ہو گئی اور پوری دنیا اندھیر ہو گئی۔ مشہور مقولہ موت العالِم موت العالَم " ایک عالم کا مرنا پورے جہاں کی موت کے برابر ہے " یونہی تو مشہور نہیں ہوا۔ عالم کی موت کا دکھ، صحیح طور پر تو علم والا ہی محسوس کر سکتا ہے چنانچہ حضرت کعب الاحبار رحمہ اللہ عالِم کی موت کو یوں بیان کرتے ہیں: نَجْمٌ طُمِسَ " ایک تارا تھا جو ڈوب گیا " كَسْرٌ لَا يُجْبَرُ " ایسا توڑ کہ جس کا جوڑ نہیں " ثُلْمَةٌ لَا تُسَدُّ " ایسا نقصان جس کی تلافی نہیں "۔ ان اقوال کی کوئی حقیقت بھی ہے یا یہ محض مبالغے اور حساسیت ہی پر مبنی ہیں اسے سمجھنے کے لیے غور کریں کہ علم زندگی بھی ہے اور روشنی بھی۔ کلامِ الٰہی میں اس کے بے شمار اشارے ملتے ہیں ﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ﴾ " ارے دیکھو وہ جو مردہ تھا ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کو نور دیا جسے لیے وہ لوگوں میں پھرتا ہے "۔ دیکھیں یہاں مردے کو زندہ کیا گیا تو اسے نور سے نوازا گیا۔ حدیثِ مبارکہ میں فتنوں سے محفوظ شخص کے بارے میں فرمایا گیا: «مَنْ أَحْيَاهُ اللهُ بِالْعِلْمِ» (مسند احمد) " جسے زندہ کیا اللہ نے علم کے ذریعے سے "۔ پس جب علم زندگی ہے تو عالِم؛ جہان کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے، تو جس نے بھی عالم کی موت کو کل جہان کی موت قرار دیا تو اس نے ہرگز مبالغہ نہیں کیا۔ رہی دوسری بات کہ علم روشنی ہے تو حدیثِ مسند احمد میں علما کو «النُّجُومُ فِي السَّمَاءِ» " آسمان کے ستارے " کہا گیا۔ اسی لیے حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنے استاذ حضرت محمد بن ادریس

الشافعی رحمہ اللہ کے لیے کہا کرتے كَانَ الشّافِعِيُّ كَالشّمسِ لِلدُّنْيا ”امام شافعی تو دنیا کے لیے سورج کی مانند تھے“۔ انھی تاروں سے تو لوگ راستہ پاتے ہیں ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ (النحل:۱۶) اور اسی روشنی کی بنیاد پر وہ لوگوں کے پیشوا بنتے ہیں تو ہدایتِ مزید کا ذریعہ بنتے ہیں: ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا﴾ (الأنبياء:۷۳) اور ہم نے انھیں پیشوا بنایا وہ ہمارے حکم سے ہدایت دیتے ہیں“۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے: «إِنَّ مَثَلَ الْعُلَمَاءِ كَمَثَلِ النُّجُومِ فِي السَّمَاءِ، يُهْتَدَى بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، فَإِذَا انْطَمَسَتِ النُّجُومُ أَوْشَكَ أَنْ يَضِلَّ الْهُدَاةُ» (مسند احمد) ”بے شک علما کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان کے تارے جو خشکی و تری کے اندھیروں میں رشد و ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ پس جب تارے ڈوب جائیں تو خدشہ ہے کہ راہِ راست کے متلاشی گم راہ ہو جائیں“۔ تو مرنے والے عالِم پر ایک عالَم رو رہا ہے۔ یہ کسی بیماریوں سے ہارے بوڑھے مریض کا نوحہ نہیں ہے نہ ہی باپ یا دادا کا ماتم ہے، یہ تو اصل میں علم کا نوحہ ہے۔ یہ غم اُس علم کے اٹھ جانے کا ہے جو وہ ساتھ لے کر چلا گیا۔ بے شک حضرتِ رفیع کی علمی روایت ان کے شاگردوں نے آپ سے لے کر محفوظ کر لی ہوگی، جو ان کے علم کے فروغ کا ذریعہ بنتے رہیں گے لیکن بات صرف روایت کی ہے اصل مسئلہ تو اس فقاہت کا ہے جو آپ ساتھ چلی گئی۔ اس لیے کہ علم کے چمن میں فقاہت کی دیدہ وری بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ تو عالم کے الفاظ تو آپ نے لے لیے اس کے معنی کا کیا کریں گے، روایت تو آپ نے لے لی اس کی درایت کہاں سے لیں گے اس کی کہاوت تو لے لی اس کی فقاہت کا کیا کریں وہ تو اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا سے پردہ فرمایا تو سیدہ ام ایمن کا رونا تھا کہ تھمنے میں نہیں آتا تھا چنانچہ انھوں نے تسلی دینے والوں کو یوں جواب دیا: إِنِّي قَدْ عَلِمْتُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَيَمُوتُ، وَلَكِنْ إِنَّمَا أَبْكِي عَلَى الْوَحْيِ الَّذِي رُفِعَ عَنَّا (مسند احمد) ”میں جانتی تھی کہ عنقریب آپ ﷺ پردہ فرما جائیں گے لیکن میں تو اس وحی پر روتی ہوں جو آپ ﷺ کے اٹھنے کے بعد منقطع ہو گئی“۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی موت پر ان کے شاگرد حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یوں تبصرہ کیا: لَقَدْ ذَهَبَ الْيَوْمَ عِلْمٌ كَثِيرٌ (مجمع الزوائد) ”آج تو علمِ کثیر چلا گیا“۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سانحۂ ارتحال پر عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں

اظہارِ خیال کیا: مَاتَ تِسْعَةُ أَعْشَارِ الْعِلْمِ "یقیناً نوے فیصد علم فوت ہوگیا" (حلیۃ الاولیاء)

مولانا محمد رفیع عثمانی رحمہ اللہ کی موت کسی عام عالِم کی موت سے بھی کچھ بڑا سانحہ ہے کہ آپ علم حلال و حرام کے ماہر تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول ملتا ہے فرماتے ہیں: لَمَوْتُ أَلْفِ عَابِدٍ قَائِمِ اللَّيْلِ صَائِمِ النَّهَارَ أَهْوَنُ مِنْ مَوْتِ الْعَاقِلِ الْبَصِيرِ بِحَلَالِ اللهِ وَحَرَامِهِ (جامع بیان العلم لابن البر) "قیام وصیام کے پابند ہزار زاہدوں کی موت ہلکی مصیبت ہے اس ایک عاقل وبینا عالم کی موت کے سامنے جو حلال و حرام کی معرفت رکھتا ہو"۔

ہمارے نامے، اعمال کے لحاظ سے کورے ہی ہیں۔ ہاں اگر ہمارے دامن میں کچھ ہے تو ان عالِموں کی محبت وعقیدت ہی ہے۔ چنانچہ حضرت کی موت نے ہمارے جسم وجان کے تار جھنجلا دیے ہیں، ہمیں حضرت ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بے اختیار یاد آتا ہے: إنّي أُخْبَرُ بِمَوتِ الرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ السُّنَّةِ فَكَأَنِّي أَفْقِدُ بَعْضَ أَعْضَائِي (حلیۃ الاولیاء) "جب میں اہلِ سنت کے کسی عالم کے انتقال کی خبر سنتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میرے تن بدن کا کوئی حصہ مجھ سے کھو گیا"!!

*****

سانحۂ ارتحال

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین اور شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے بڑے بھائی؛ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۸ نومبر ۲۰۲۲ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کامل مغفرت فرمائیں اور ان کی قبر کو جنت کا باغ بنا دیں۔ آمین

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

# خرچ کرنے میں اعتدال

سورۃ الفرقان، آیت: ٦٧

﴿وَالَّذِینَ إِذَا أَنفَقُوا لَم یُسرِفُوا وَلَم یَقتُرُوا وَكَانَ بَینَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾

''اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط و تفریط) کے درمیان اعتدال کا ہے''۔

## تفسیر و توضیح

سورۂ فرقان کی زیرِ مطالعہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خالص اور منتخب بندوں کے وہ اوصاف بیان فرمائے ہیں، جو انھیں دیگر بندوں سے ممتاز کرتے اور انھیں عباد الرحمن کی صف میں شامل کرتے ہیں۔ ان بلند اوصاف میں سے چار کا ہم ماقبل آیات کے ضمن میں مطالعہ کر چکے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بلند اوصاف کے حامل بندے وہ ہیں جو تکبر اور بڑائی سے بچتے ہیں، جہلا اور کم عقل لوگوں کے ساتھ الجھنے سے دور رہتے ہیں، عبادت کا اہتمام کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یہاں آیتِ مذکورہ میں انہی اوصاف میں سے پانچواں وصف ذکر کیا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اموال خرچ کرنے میں اعتدال و توسط سے کام لیتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں جہاں زندگی کے دیگر شعبوں سے متعلق رہنمائی کی گئی ہے، وہاں اپنا مال، اپنی کمائی خرچ کرنے کے بارے میں بھی بہترین اصولوں سے نوازا گیا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے اموال میں سے اپنی ضروریات اور اپنے اہل و عیال پر

خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، وہیں ہمیں یہ حکم بھی دیا ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے رزق کو خرچ کرنے میں اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَم يُسرِفُوا وَلَم يَقتُرُوا وَكَانَ بَينَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ ”اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط وتفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے“۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے یہ بندے اپنے اموال کے خرچ کرنے میں اسراف نہیں کرتے، بلکہ اپنی ضروریات میں خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی بخل سے کام لیتے ہیں کہ اپنے اہل وعیال کے حقوق کی ادائی میں کوتاہی کے مرتکب ہوں، بلکہ اس معاملے میں نہایت اعتدال اور میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔

## اسراف، قتر اور قوام کا مفہوم

آیت مبارکہ میں؛ اسراف، قَتر اور قوام کی اصطلاحات استعمال فرمائی گئی ہیں کہ اللہ کے نیک بندے اپنے اموال کے خرچ کرنے میں اسراف یعنی فضول خرچی اور قتر یعنی بخل سے بچتے ہیں اور اس معاملے میں قوام یعنی اعتدال پر گامزن رہتے ہیں۔ علامہ زمخشری رحمہ اللہ اسراف اور قتر کی شرح میں فرماتے ہیں: قُرِئَ ﴿يَقْتُرُوا﴾ بِكَسْرِ التَّاءِ وَضَمِّها. وَيَقْتُرُوا، بِتَخْفِيْفِ التّاءِ وتَشْدِيدِها. والقتر والإقتار والتقتير: التّضْيِيقُ الذي هو نقيض الإسراف. والإسراف: مُجَاوَزَةُ الْحَدِّ في النفقة. (الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل، ج:۳، ص:۲۹۲) ”﴿يَقْتُرُوا﴾ “تا” کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ، اسی طرح “تا” کی تخفیف اور تشدید کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ چنانچہ “قتر”، “اقتار” اور “تقتیر” کا مفہوم ہے: تنگی، بخل جو اسراف کی نقیض ہے، یعنی عکس ہے۔ جبکہ اسراف کہتے ہیں: خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا“۔ جبکہ قوام کہتے ہیں وسط واعتدال کو، تفسیر الوسیط میں ہے: وقَوَامًا: بالفتح وسطًا وعدلًا، وسمى قوامًا، لاستقامة الطرفين وتعادلهما، وقرىء: قواما بكسر القاف، فقيل: هما لغتان بمعنى واحد، وقيل: القِوام بالكسر: ما يُقام به الشيءُ، ومعناه هُنا ما تُقام به الحاجةُ لا يَفْضُلُ عنها ولا يَنْقُصُ. (التفسير الوسيط للقرآن الكريم، ج:۷، ص:۱۵۴۲) ”قوام ’ق‘ کے فتحہ کے ساتھ وسط واعتدال کو کہتے ہیں، اسے قوام اس لیے کہتے ہیں کہ یہ دو انتہاؤں کے درمیان واقع ہوتا ہے اور یہ دونوں

اطراف کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔قوام 'ق' کے کسرے کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، کسرے کے ساتھ اس کے دو معنیٰ بیان کیے گئے ہیں: پہلا معنیٰ وہی ہے جو فتحہ کے ساتھ ہے، جبکہ دوسرا معنی یہ بیان کیا گیا کہ جو کسی چیز کا قائم مقام بن سکے۔اس کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ انفاق جو حاجت کے لیے کافی ہو جائے، نہ اس سے زیادہ ہو اور نہ کم ہو"۔

## اسراف اور بخل کی تحدید

اسراف کی تحدید میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ تفسیر الوسیط میں بعض حضرات کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ: أنّ الإنفاقَ في طاعةِ اللهِ ليس سَرَفًا مَهْما بَلَغَ، وَلِهَذا تَرَكَ رسولُ اللهِ ﷺ سَيِّدَنا أَبا بكرٍ يَتَصَدَّقُ بِمالِه كُلِّه، وأَقَرَّه عليه. (التفسير الوسيط للقرآن الكريم، ج:۷، ص:۱۵۴۱) "اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا اسراف نہیں اگرچہ زیادہ ہی ہو، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اجازت دی کہ وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں"۔ چنانچہ امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لو أَنْفَقْتَ مِثْلَ أَبي قُبَيْسٍ ذَهَبا في طاعةِ الله ما كان سَرَفا، ولو أنفقتَ صاعا في معصيةِ الله كان سرَفا. (جامع البيان في تأويل القرآن، ج:۱۹، ص:۲۹۹) "اگر آپ ابو قبیس پہاڑ کے بقدر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو یہ اسراف نہیں ہے اور اگر گناہ کے کام میں ایک صاع بھی خرچ کریں تو یہ اسراف ہے"۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وقيل الإسرافُ هو الإنفاقُ في المحارمِ والتقتيرُ منعُ الواجبِ(أنوار التنزيل وأسرار التأويل، ج:۴، ص:۱۳۰) "یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسراف نام ہے حرام اور معاصی میں مال خرچ کرنے کا، اور جہاں مال خرچ کرنا ضروری ہو وہاں خرچ سے رُکا جائے تو یہ بخل ہے"۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے اس قول سے ایک تو بخل کی تعریف واضح ہوئی کہ اپنی جائز ضروریات یا حقوقِ واجبہ میں خرچ نہ کرنا بخل ہے۔ جب کہ دوسری اہم بات اس قول سے یہ معلوم ہوئی کہ اسراف گناہ میں خرچ کرنے سے لازم آتا ہے چاہے خرچ کردہ مقدار معمولی ہی کیوں نہ ہو۔اس توجیہ کا ایک قرینہ آیت باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاٰتِ ذَاالقُربٰی حَقَّه وَالمِسكِینَ وَابنَ السَّبِیلِ وَلَاتُبَذِّر تَبذِیرًا إِنَّ المُبَذِّرِینَ کَانُوا إِخوَانَ الشَّیٰطِینِ وَکَانَ الشَّیطٰنُ لِرَبِّه کَفُورًا﴾

(سورۃ الاسراء، آیت:۲۶۔۲۷) ”اور رشتے دار کو اس کا حق دو، اور مسکین اور مسافر کو (ان کا حق دو) اور اپنے مال کو بے ہودہ کاموں میں نہ اڑاؤ۔ یقین جانو کہ جو لوگ بے ہودہ کاموں میں مال اڑاتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے“۔ یہاں مساکین پر خرچ کرنے کے مقابل تبذیر کا ذکر کیا گیا تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ راہِ خدا میں خرچ ہونے والا مال اسراف کے زمرے میں نہیں آتا اگرچہ بے تحاشا ہو۔ البتہ دنیاوی کاموں میں ضرورت سے زیادہ یا معاصی میں خرچ ہونے والا مال اسراف کے زمرے میں آتا ہے۔

یہ تو اسراف کی تحدید کے بارے میں اہلِ علم کی ایک رائے ہے جب کہ اہلِ علم کی ایک جماعت کی رائے اس کے برعکس بھی ہے۔ جس کی رو سے اگر دینی امور میں بھی حد سے زیادہ خرچ کریں تو یہ اسراف میں شامل ہو جائے گا: الإسرافُ هو الإفراطُ ومجاوزةُ الحدِّ في الإنفاقِ دُنْيا ودِينًا. (التفسير الوسيط للقرآن الكريم، ج:۷، ص:۱۵۴۱) ”اسراف؛ مال خرچ کرنے میں افراط اور حد سے تجاوز کو کہتے ہیں خواہ وہ دنیوی مقاصد میں خرچ ہو یا دینی میں ہو“۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تجعل يَدَكَ مَغلُولَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَاتبسُطهَا كُلَّ البَسطِ فَتَقعُدَ مَلُومًا مَّحسُورًا﴾ (سورۃ الاسراء، آیت:۲۹) ”اور نہ تو (ایسے کنجوس بنو کہ) اپنے ہاتھ کو گردن سے باندھ کر رکھو، اور نہ (ایسے فضول خرچ کہ) ہاتھ کو بالکل ہی کھلا چھوڑ دو، جس کے نتیجے میں تمھیں قابل ملامت اور قلاش ہو کر بیٹھنا پڑے“۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: «إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ، خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ» (صحیح بخاری، حدیث:۱۲۹۵) ”اگر تم اپنے ورثہ کو غنی چھوڑ دو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں فقیر بنا کر چھوڑو کہ وہ دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہوں“۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مال خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا مطلق ہے، خواہ دینی مقصد میں خرچ ہو یا دنیوی مقصد میں۔ یعنی ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مال و دولت کے بارے میں احساسِ ذمے داری کا ثبوت دے اور اسے بے جا اور غیر ضروری کاموں میں خرچ نہ کرے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت بھی اس بات کا خیال رکھے کہ زیادہ مال خرچ کرنے سے کہیں دیگر حقوق واجبہ کی ادائی میں کوتاہی کا خطرہ تو نہیں

پیدا ہو رہا یا خود قلاش ہو کر مانگنے کی نوبت تو نہیں آئے گی! چونکہ اسلام ہر شعبۂ زندگی کی طرح مال خرچ کرنے میں بھی میانہ روی کا درس دیتا ہے، اس لیے یہاں بھی یہ ضروری قرار پاتا ہے کہ آدمی اس کا خیال رکھے کہ سارا مال خرچ کر کے مشکل میں نہ خود مبتلا ہو اور نہ ہی دوسرے متعلقین کو مبتلا کرے۔

ان دونوں اقوال میں اس حد تک اتفاق ہے کہ جو مال معاصی میں خرچ ہو، وہ اسراف میں آتا ہے، اور جو مال امورِ واجبہ کی ادائی سے روک دیا جائے وہ بخل میں آتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق خرچ ہو وہ قوام ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنا سارا مال راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے تو کیا یہ اسراف کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں اس نکتے پر اختلاف پایا جاتا ہے جس کا بیان اوپر ہو چکا۔ ان دونوں آرا میں ایک تطبیق اور اختلاف کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ پہلی رائے یعنی راہِ خدا میں خرچ کرنا اسراف نہیں ہے چاہے کل مال دے دیا جائے۔ یہ خواص اور اخص الخواص کے لیے ہے۔ ہمارے سامنے اس کی مثال ذاتِ رسول اللہ ﷺ میں بھی پائی جاتی ہے اور ہمارے سامنے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مثال بھی موجود ہے۔ عامۃ الناس کے لیے دوسری رائے مناسب ہے کہ اللہ کے راستے میں بھی زیادہ خرچ کرنا اسراف میں داخل ہے اور انھیں چاہیے کہ اللہ کے راستے میں بھی اپنے حقوقِ واجبہ کی رعایت کرتے ہوئے اعتدال کے ساتھ خرچ کریں۔ دینی کاموں میں مال خرچ کرنے میں اس حد تک تجاوز نہ کریں کہ حقوقِ واجبہ کی ادائی میں کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔ علامہ زحیلی رحمہ اللہ نے اس کی بہترین شرح کی ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں: والمرادُ من النَفَقَةِ نَفَقَةُ الطاعاتِ في المُباحاتِ، فهذِه يُطالَبُ فيها الإنسانُ ألّا يُفْرِطَ فيها حتى يُضِيعَ حقا آخرَ أو عِيالا، وألا يُضيقَ أيضا ويَقْتُرَ، حتى يَجِيعَ العيالُ، ويُفْرِطَ في الشُّحِّ. والحسنُ في ذلك هُو القَوامُ، أي العدلُ، والقوامُ في كلِّ واحدٍ بحَسْبِ حاله وعِياله، وصَبْرِه وجَلَدِه على الكسْبِ، وخيرُ الأمورِ أوساطُها، وهذهِ الوَسْطِيَّةُ خيرٌ لِلإنسانِ في دينِه وصحتِه ودنياه وآخرتِه.أمّا النَفَقَةُ في معصيةِ اللهِ فهُوَ محظورٌ حَظَرَته الشريعةُ قليلا كان أو كثيرا، وكذلك التَّعَدّي على مالِ الغيرِ، هُو حرامٌ أيضا. (التفسير المنير في العقيدة والشريعة والمنهج، ج:۱۹، ص:۱۱۵) ”یہاں انفاق سے مراد مباحات میں مال خرچ کرنا ہے۔ اس میں انسان سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنے اموال خرچ

کرنے میں اِفراط سے کام نہ لے کہ دیگر لوگوں اور اہل وعیال کے حقوق ضائع ہوں، اور نہ ہی اتنی تنگی سے کام لے کہ معاملہ بخل کی حد تک چلا جائے اور اہل وعیال بھوکے رہیں۔ اس معاملے میں قَوام یعنی اعتدال بہتر ہے، قوام ہر شخص کے حال اور اس کے اہل وعیال اور اس کے صبر وبرداشت کے حساب سے اس کی مالی وسعت پر منحصر ہے۔ تمام امور میں میانہ روی بہتر ہے اور یہ میانہ روی انسان کے لیے اس کے دینی معاملات، اس کی صحت، غرض اس کی دنیا وآخرت کے تمام معاملات میں بہتر ہے۔ جہاں تک معاصی میں خرچ کرنے کا معاملہ ہے تو یہ شریعت کی رو سے ویسے ہی ممنوع ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ، اور اسی طرح غیر کے مال میں تعدی وتصرف کرنا حرام ہے"۔

لہٰذا اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اموال کو خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرتا ہے، خواہ اپنے اوپر اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا ہو یا خیر کے دیگر کاموں میں صدقہ کرنا ہو، مثلاً، فقرا و مساکین پر صدقہ کرنا، مصالحِ عامہ میں صرف کرنا ہو۔ چنانچہ یہاں بہترین طریقہ اعتدال وتوازن کا راستہ ہے، نہ اسراف سے کام لے کہ حقوقِ واجبہ کی ادائی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جائے اور نہ ہی بخل وکنجوسی سے کام لے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہی نہ ہو، کیونکہ اس سے بھی منع کر دیا گیا ہے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے: «إذَا أَنْعَمَ اللهُ عَلَى عبْدٍ نِعْمَةً أَحَبَّ أَنْ يَرَى أَثَرَهَا عَلَيْهِ». (جامع البيان في تأويل القرآن، ج:۱۹، ص:۳۰۱) "جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر مال کے ذریعے انعام کیا ہے تو وہ یہ بھی پسند کرتا ہے کہ اس کے مال کا اثر اس کے احوال سے ظاہر ہو"۔ اسی طرح حرام؛ عیاشی، رشوت، دنیاوی شہرت جیسے کاموں میں خرچ نہ ہو۔ لہٰذا جس طرح اسلامی تعلیمات میں ہمارے لیے ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی کی گئی ہے اسی طرح مال خرچ کرنے میں بھی اعتدال اور میانہ روی کا درس ملتا ہے۔ اس سے انسان حقوق کی ادائی میں اور اپنے معاملات چلانے میں مشکل سے بچ سکتا ہے اور یہی ہر عقل مند آدمی کا طرزِ عمل ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی دولت جائز ضروریات میں ہی صرف کرتا ہے۔ چنانچہ حدیثِ مبارکہ میں آتا ہے: «مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ رِفْقُهُ فِي مَعِيشَتِهِ» (مسند احمد، حدیث:۲۱۶۹۵) "آدمی کے سمجھ دار ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے اخراجات میں میانہ روی اختیار کرے"۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

# انبیاے کرام علیہم السلام کے جانشین

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْعُلَمَاءُ خُلَفَاءُ الْأَنْبِيَاءِ» (مجمع الزوائد و قال الهيثمي رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ)

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''علماے دین؛ انبیاے کرام کے خلیفہ اور مسند نشین ہیں''۔

تشریح

اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا اپنی امت کے ساتھ تعلق متعدّد نسبتوں پر مبنی تھا۔ ایک طرف آپ ﷺ مسلمانوں کے حکمران تھے اور اسلامی حدود اور نظام کا قیام آپ ہی کے ذمے تھا۔ دوسری طرف آپ ﷺ مسلمانوں کے لیے قرآن وسنت کی تعلیم وتشریح بھی فرماتے تھے اور تیسری طرف آپ ان کی تربیت وتزکیے کے بھی ذمے دار تھے۔ نبی کریم ﷺ کے بعد مختلف گروہوں نے آپ کی امت میں آپ ﷺ کی جانشینی کی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی سیاسی نیابت خلفا نے کی اور ان کے لیے خلیفہ کی اصطلاح کا استعمال بھی ہوا جو مشہور و معروف ہے۔ نبی کریم ﷺ کی علمی جانشینی علماے اہل سنت نے کی۔ ان کے دو بڑے گروہ ہیں جن پر فقہ و روایت کا غلبہ رہا: وہ علما و فقہا کہلائے اور جنھوں نے امت کے تربیت وتزکیہ کا بیڑا اٹھایا وہ صوفیا کہلائے۔ چونکہ خلیفہ کی اصطلاح ایک سیاسی منصب کے لیے رائج ہو چکی تھی اس لیے علما و صوفیا کے لیے خلیفہ کی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ دونوں طبقے امت میں

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نیابت ہی کرتے ہیں جس کی طرف حدیثِ زیرِ مطالعہ میں لفظ خلیفہ سے اشارہ کیا گیا۔ البتہ صوفیاے کرام کے حلقے میں خلیفہ مجاز کی اصطلاح کا استعمال عام ہے یعنی کسی شیخِ مربی کا وہ شاگرد و مرید جس کی تربیت ایک خاص درجے تک ہو چکی ہو اور اب اسے اپنے شیخ کی طرف سے عامۃ الناس کی تربیت اور اس مقصد کے لیے بیعت لینے کی اجازت دی گئی ہو۔ اصطلاح کا یہ استعمال اسی تصورِ نیابت کے تحت ہی رائج ہوا ہے۔ سننِ ترمذی کی روایت میں علماے کرام کے لیے وارث کا لفظ آیا ہے: «إِنَّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلاَ دِرْهَمًا إِنَّمَا وَرَّثُوا العِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ» ”بے شک علما؛ انبیاے کرام کے وارث ہیں اور بے شک انبیا، درہم و دینار نہیں چھوڑ جاتے بلکہ وہ تو علم چھوڑ جاتے ہیں، جس نے اس علم کو لے لیا اس نے (اس وراثت میں سے) بڑا حصہ پا لیا۔

ایک کمزور درجے کی روایت میں ان علمی جانشینوں کے لیے یوں دعا منقول ہوئی ہے: «اللَّهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِي» ”اے اللہ میرے خلفا پر رحم فرما“۔ پوچھا گیا کہ آپ کے یہ خلفا کون ہیں؟ تو خلفا کی تعریف ان کے وظیفے کے ساتھ کی گئی: «الَّذِينَ يَرْوُونَ أَحَادِيثِي وَسُنَّتِي وَيُعَلِّمُونَهَا لِلنَّاسِ» ” وہ جو میری احادیث اور سنتیں بیان کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی (علمی و عملی) تعلیم کرتے ہیں“۔ (المعجم الاوسط، طبرانی) نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ان جانشینوں کی عزت و احترام اور ان کے حقوق کی ادائی ہماری دینی ذمے داری ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے: ”بے شک بوڑھے مسلمان کی عزت کرنا، اُس حاملِ قرآن کی عزت کرنا جو نہ تو قرآن کے آداب و حدود کو پامال کرتا ہو اور نہ ہی اس سے بے رغبتی و بے تعلقی کا مظاہرہ کرتا ہو اور عادل حکمران کی عزت کرنا، اللہ تعالیٰ کی عزت میں سے ہے“۔ (سنن ابی داؤد) آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا جو ہمارے دین کے عالم کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں“۔ (صحیح الترغیب والترہیب)

* * * * *

گفتگو: ڈاکٹر محمد رشید ارشد

ٹرانسکرپشن: دانیال بن شفیق

# جامعہ بحریہ کے اساتذہ سے گفتگو

## قسط نمبر ۲

شعبۂ اسلامی علوم، جامعہ بحریہ، کراچی، کے اساتذہ سے گفتگو، جسے ضبط و ترتیب کے بعد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے

الحاد کا جو زیادہ بڑا سبب ہے، وہ اخلاقی ہے، وہ عقلی اور علمی نہیں ہے، یعنی بالفرض پاکستان کے اگر سو ملحد ہیں تو چار، پانچ ہوں گے اُن میں سے جنھوں نے واقعتاً کسی عقلی، علمی بنیاد پر اللہ کو چھوڑا ہے، کہ نہیں بھئی واقعی ہمیں سمجھ میں نہیں آرہا اور یہ ہمارے اشکالات ہیں۔ زیادہ تر لوگ تو شہوتوں کی وجہ سے چھوڑتے ہیں یعنی ہمارے علما جو بیان کرتے تھے نا کہ شیطان کے انسانوں پر دو بڑے وار ہیں: نمبر ایک: شبہات پیدا کرتا ہے، نمبر دو: شہوات کی طرف لے کر جاتا ہے۔ شبہات والے ملحد آج بھی بہت تھوڑے ہیں، اصل میں شہوات ہیں، یہ لوگ ایک آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، جبلتوں کے تحت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، خدا کا تصور، آخرت کا تصور haunt کرتا ہے، شرم پیدا کرتا ہے تو پھر بنے بنائے بن جاتے ہیں یعنی کہیں سے دلائل مل جاتے ہیں، ہر دور میں کچھ لوگ بہت مشہور ہوتے ہیں نا، پچھلی صدی میں برٹرنڈ رسل بہت مشہور تھا۔ New Atheism میں ۲۰۰۰ء کے بعد اور ۹/۱۱ کے بعد رچرڈ ڈاکنز بہت مشہور تھا، اب پچھلے تین، چار سال سے Yuval Noah Harari جو ایک اسرائیلی مفکر ہے، بہت مشہور ہے۔ وہ تو اصل میں ایک تاریخ دان ہے، وہ بہت شہرت رکھتا ہے۔ تو پھر بنے بنائے دلائل مل جاتے ہیں، اُس پہ پھر وہ بات کرتے ہیں۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ ان ملحدین کا علاج کیا ہے؟ تو ابھی بھی میری ناقص رائے میں، کسی بھی طرح کے جو ملحد ہیں، اُن کا علاج گفتگو یا مناظرہ نہیں ہے بلکہ دین کی جو

وجودی manifestations ہمارے پاس ہیں یعنی کسی نیک، صالح آدمی کو دیکھ لینا، اُس کے پاس بیٹھ جانا، اُس کی صحبت اختیار کرنا، کسی اللہ والے کی مجلس میں آنا جانا، یہ شاید آج بھی سب سے زیادہ مفید ہے کیونکہ ذہن سے کیا ہوتا ہے؟ کچھ بھی نہیں ہوتا، ہمارے ہاں فلسفے میں یہ مشہور ہے کہ وہ جو Newton's Law ہے نا، اُس کی پیروڈی بنائی گئی ہے کہ:

To every theory, there is an equal and opposite theory. ہر تھیوری کے مقابل میں ایک تھیوری ہوتی ہے، وہ دوسری کو کاٹتی رہتی ہے۔ تو اصل چیز تو وجودی اظہار ہے نا تو اِسی لیے دین داری کے نمونے اگر بڑھیں گے اور پھر دین داری پر مبنی کوئی سماج اگر ہم پیدا کرلیں اور دین داری یا دینی کوئی quality ہم بنا سکیں، اُس کا کوئی رول ماڈل سامنے ہو، تو ہم دیکھیں گے کہ یہ الحاد یا بے دینی بہت تیزی سے ختم ہوگی، اُس سے پہلے تو مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا آئیڈیا بہت بڑا ہے، ہم اُس کو actualize نہیں کر پاتے، مغرب اپنے ہر آئیڈیا کو actualized کر لیتا ہے تو ہماری باتیں بہت بڑی بڑی ہیں، ہمارے پاس تھیوری بہت بڑی ہے لیکن collectivity میں چونکہ اُن کو وہ کہیں actualized نظر نہیں آتی، individuality میں تو ہیں آج بھی، ہر طرف ہیں، مختلف pockets میں لوگ ہیں، collectivity میں نہیں ہیں، سماج میں بھی اُس طرح نہیں ہیں کہ پورا ایک سماج اِس پر قائم ہو اور مملکت میں تو بالکل بھی نہیں ہیں، کوئی ماڈل ہمارے پاس نہیں ہے تو اِس کی وجہ سے بھی ہمارے ہاں شاید لوگ جو کہتے ہیں نا کہ الحاد بڑھ رہا ہے تو اُس کا سبب شاید یہ بھی ہے کہ ہمارے پاس اُس کی کوئی collective manifestations نہیں ہیں۔ یہ بس چند ایسی متفرق باتیں تھیں، میں نے تو بہت گفتگو کی، آپ سب لوگ اصحابِ علم ہیں، بس اِس بارے میں اب آپ لوگ کچھ ارشاد فرمائیں۔

## سوال و جواب

سوال: سر یہ جو آپ نے لاتعلقی کی بات کی جس کو ہم اگر دوسرا نام دیں تو individualism یا individualistic ہے جو انسان کے اوپر طاری ہو جاتا ہے اور اِس advanced زمانے سے پیچھے جیسے چھے، آٹھ سال پہلے ہم دیکھتے ہیں تو علما، صلحا اور بڑوں کے ساتھ بیٹھکیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں، اب تقریباً کوشش یہ ہوگئی ہے کہ لوگ individualistic life کو گزاریں، چونکہ ہم ٹیچرز بھی ہیں تو اِس کو اسٹوڈنٹس کے درمیان کیسے encourage کیا جا سکتا ہے؟ کیسے ہم اِس کو بڑھا سکتے

ہیں؟ اسی طرح جیسے ہم لاتعلقی کہہ رہے ہیں، اگر رشتوں میں بھی دیکھ لیں تو یہی لاتعلقی بہت زیادہ ہے۔ کئی جگہوں پر urban societies میں تو سنگین معاملہ ہوجائے تب جاکر کچھ ملنا ملانا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رشید ارشد صاحب: دیکھیں individualism تو ظاہری بات ہے جو American ethos ہے یا modernity کے لیے ethos ہے، وہ individualistic ہی ہے۔ انفرادیت پسندی ظاہر ہے کہ اُس کا سبب ایک جدید طرزِ زندگی ہے اور مثال کے طور پہ جوائنٹ فیملی سسٹم جب ہوتا تھا نا تو آپ کے اوپر کئی بڑے ہوتے تھے یعنی لوگ یہ کہتے ہیں نا کہ دیکھیں آج لوگوں کا gulf جانا اور سال، سال بعد آنا، دو، دو سال بعد آنا، یہ وہ نہیں ہے جو کبھی تجارت یا دین کی تبلیغ کے لیے جانا ہوتا تھا۔ اُس وقت چار، چار، پانچ، پانچ بڑے رشتے دار ہوا کرتے تھے۔ چچا، تایا ہیں یا دادا، دادی ہیں وغیرہ۔ پوری collectivity ہے نا، پورا ایک برادری کا نظام ہے، جس میں آپ رہتے ہیں تو اب مسئلہ یہ ہوتا ہے جس طرح Sartre، ایک بہت مشہور existentialist ہے، وہ کہا کرتا تھا کہ Hell is other۔ other جو ہے نا، وہ جہنم ہے کیونکہ میرا ہر other میری آزادی کو curtail کرتا ہے، تو آپ بالکل اکیلے ہوں تو آزاد ہیں، کسی عورت کے ساتھ آپ cohabitation میں رہ رہے ہیں شادی کے بغیر تب بھی آپ آزاد ہیں کیونکہ قانونی معاہدہ نہیں ہے پھر بچے پیدا کرنا آپ کو باندھ دیتا ہے تو بچے نہ ہوں، تو یہ اور آزادی ہے اور اب یہی معاملہ ہے۔ لیکن کیا اس پر بھی انھیں آزادی مل گئی؟ نہیں۔ ایک بہت بڑا مسئلہ کیا ہے؟ کہ یہ سب کرنے کے باوجود بھی وہاں پر اسٹیٹ بہت طاقتور ہے اور اسٹیٹ نے گویا خدا کی جگہ لے لی ہے اور خدائی اوصاف اُس نے اپنے اندر پیدا بھی کر لیے ہیں یعنی وہ omnipotent (قادرِ مطلق) بن گئی ہے، انتہائی طاقتور ہوگئی ہے، omniscient (عالمِ کُل) ہوگئی ہے، بہت زیادہ معلومات اُس کے پاس ہیں لیکن individualism کو پچھلے بیس ایک سال میں جو بہت زیادہ بڑھاوا دیا ہے، وہ دیا ہے میڈیا نے یا ٹیکنالوجی نے۔ سوشل میڈیا اس پر بہت اثرانداز ہوا ہے۔ اب جو آپ بات کر رہے ہیں نا کہ بزرگوں کے پاس لوگ نہیں بیٹھتے، وجہ کیا ہے؟ کہ جی یوٹیوب ایک ایسا ایک جن ہے جو چیز آپ کو چاہیے، جو سودا آپ کو چاہیے، وہ اُس میں مل جائے گا اور یہ آپ نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا نا نوجوانوں کو کہ یار میں تو اُس کو فالو کرتا ہوں، میں آج کل اُس کو بہت دیکھتا ہوں اور اُن کو پسند آجاتے ہیں کوئی مولوی صاحب یا کوئی بھی اسکالر یہاں کے یا باہر کے۔ آٹھ،

آٹھ، دس، دس گھنٹے اُن کی وڈیوز دیکھتے رہتے ہیں لیکن اُس سے کوئی شخصیت میں فرق نہیں پڑتا کیونکہ آدمی تو آدمی سے بدلتا ہے نا، میرے خیال میں اِس کا جو damage ہے، وہ بہت ہی زیادہ ہے، ابھی تین، چار مہینے پہلے سیرت النبی ﷺ پر ایک مجلس تھی، ورچوئل یونیورسٹی لاہور میں سینٹر تھا، وہاں ریکٹر صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں اور اُنھوں نے مجھے بلایا گفتگو کرنے کے لیے تو میں نے اُن سے یہی کہا تھا کہ میرے نزدیک اِس وقت انسانیت کو جو سب سے بڑا خطرہ ہے، وہ ورچوالٹی سے ہے تو IA اور cybernetics اور bio-tech اور info-tech کی جواب marriage ہو رہی ہے، اِس کے بعد تو اب انسان ہونے کا کیا مطلب ہے، یہ بھی نہیں پتا۔ تو اب اِس نے بہت زیادہ alienate کر دیا ہے، آپ کی فیس بک پہ جناب چار سو دوست ہیں اور گوشت پوست کا ایک زندہ دوست بھی نہیں ہے تو یہ خطرناک بات ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ ہمیں تھوڑا سا لوگوں کو اِس طرف توجہ دلانی چاہیے کہ ماڈرن ٹیکنالوجی اور gadgets جو ہیں مطلب میں اب ذاتی طور پر اِن کو ایک necessary evil سمجھتا ہوں کہ اِن کو اِس سطح پر رکھیں تو بچت ہے، اگر اِس سے کوئی توقعات وابستہ کر لیں نا جو ہمارے ہاں کچھ مذہبی لوگوں کو ہوتی ہیں کہ اب اسی سے اسلام پھیلے گا اور جناب اب اِس کے ذریعے کمال ہو جائے گا، کچھ بھی نہیں ہو گا، سب ختم ہو جائے گا اور ہو رہا ہے۔ کچھ چیزیں آپ کو پتا لگ جائیں گی اور بس۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے نا کہ جو بھی روایتی دین کو پھیلانے کے اور بتانے کے طریقے ہیں، وہ بہت اہم ہیں، اُن کو نہیں چھوڑنا چاہیے، اب یہ جو دو سال پچھلے گزرے ہیں، اِس میں جو آن لائن موڈ پر آپ کو لے آئے ہیں، ایک تجربہ کیا ہے اُنھوں نے، تو میری ناقص رائے میں یعنی بہت سے دینی مدارس بھی اور دینی ادارے بھی اِس موڈ پر آ گئے جو ایک خطرناک بات ہے۔ ابھی تو مجبوری تھی نا، پھر یہ ہو سکتا ہے کچھ عرصے بعد یہ آن لائن نظام ہی مستقل کر دیں اور اب آپ دیکھتے ہیں نا کہ لوگوں کے اندر یہ convincing بڑھ رہی ہے، پیٹرول اِتنا مہنگا ہو گیا، commute کرنا اِتنا مشکل ہو گیا ہے۔ تو اب آپ اِسے آن لائن کر ہی دیں، چاہے کوئی وائرس کا آپ کو ڈر ہو یا نہ ہو تو ہمیں اندازہ ہے، ہم نے پڑھایا ہے دو سال آن لائن، یونیورسٹی کے بچوں کو، تو وہ کچھ بھی نہیں ہے، فراڈ ہے وہ، ہم اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے تھے، بچے بھی ہم سے کھیل رہے تھے تو یہ جو صورتِ حال ہے، یہ میرا خیال ہے بہت خطرناک ہے اور اِس وقت تو مغربی افکار وغیرہ ایک طرف رہ گئے ہیں، سب سے خطرناک چیز وہ ہے جو ہم اپنی جیبوں میں لے کر گھوم رہے ہیں اور وہ اسمارٹ فونز ہے، اسمارٹ فون جہاں آ گیا نا، وہاں اب لبرل وائرس سے یا بے دینی سے

بچنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔

سوال: اِس کو کیسے پروموٹ کیا جائے جیسے صلحا سے، علما سے یا بڑوں سے سیکھنا، اب تو بچے اپنے بڑوں سے بھی مشاورت نہیں کرتے، دیکھتے بھی نہیں، مشاورت تو دور کی بات ہے۔

ڈاکٹر رشید ارشد صاحب: ہاں دیکھیں سمجھا ہی سکتے ہیں نا اور دوسری بات یہ کہ بھئی کیا ہم اُن کے لیے کوئی رول ماڈل ہیں؟ یعنی کیا ہم وہ زندگی بسر کر رہے ہیں، جو ہم چاہتے ہیں کہ وہ کریں؟ اگر اُن کو نظر آئے گا تو وہ بھی ہماری نقل کریں گے۔ پہلے تو، بچپن سے ہی لوگ لے جایا کرتے تھے محفلوں میں بزرگوں کے پاس، یہ عمل تو ہونا چاہیے نا، بچپن سے۔

سوال: سر جو تقسیم سے پہلے ایک فضا تھی، ہم ایک آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے یعنی ایک struggle تھی جس میں مدارس جس ایجنڈے کے تحت کھولے گئے وہ یہ تھا کہ دین کی بنیادی چیزوں کو بچایا جائے، ایک تعلیم کا، تبلیغی جماعت کا سلسلہ جاری کیا جائے، گویا ایک دفاعی صورتِ حال تھی، اب حالات یکسر مختلف ہیں اور وہ چیز ختم ہو گئی ہے، اب نئے محاذ ہیں اور نسبتاً اقدامی صورتِ حال ہے۔ تو اِن چیزوں سے بچاؤ کے لیے ہمارے پاس کیا نظام ہے؟ یا ہمارے بڑوں نے، اِن مدارس کے بزرگوں نے تعلیمی نظام میں کون سی ایسی تبدیلیاں پیدا کی ہیں جس سے کہا جا سکے کہ کچھ نہ کچھ اُس رخ پہ ہم چلے جائیں یا وہی پارٹیشن سے پہلے کا جو نظام ہے، وہی چل رہا ہے؟ اور سر! الحاد کا جو ایک طوفان آ رہا ہے بلکہ آ چکا ہے اور ایک سیلاب ہے، جس میں سارے بہہ رہے ہیں، تو اِس تناظر میں ہمارے مذہبی ادرے اور مدارس کے بڑے مفکرین کیا سوچتے ہیں؟

ڈاکٹر رشید ارشد صاحب: ہاں یہ اچھا سوال ہے آپ کا، یہ بات ٹھیک ہے کہ اُس وقت تو survival کا مسئلہ تھا اور دفاع کا مسئلہ تھا اور اُس میں تو یہ تھا کہ بھئی اگر ہم نے بھی اُن علوم کو شامل کیا، انگریزی وغیرہ کو یا سائنس کو تو سب لوگ اُس طرف بھاگ رہے ہیں کیونکہ معاش اُس سے وابستہ ہو گیا ہے تو اگر ہم میں سے کچھ لوگ جو ہیں، وہ نکّو بننا قبول نہیں کریں گے اور اپنا پتا مار کے، وہ جو ہمارے پاس ایک علمی تُراث ہے، اُس کو ہم محفوظ نہیں کریں گے تو یہ سب ختم ہو جائے گا، لیکن اُس میں بھی میرا خیال ہے کہ پارٹیشن یعنی انگریز کے یہاں آنے سے پہلے بھی کچھ مسئلے تھے۔ کیونکہ دیکھیں، ہمارے ہاں کوئی دوئی تو نہیں تھی نا، علم ایک ہی تھا لیکن ہم سے کچھ کوتاہی ہوئی ہے کہ ہم نے اُس کو اپڈیٹ نہیں کیا اور چلو اُس وقت نہیں کیا، ابھی تک بھی نہیں کیا یعنی ابھی تک بھی

Aristotelian logic آپ پڑھا رہے ہیں، logic بالکل بدل گئی، اب symbolic logic ہے، ابھی تک آپ Ptolemaic model پڑھا رہے ہیں یعنی بطلیموسی ماڈل، مطلب وہ Galileo آ گیا، دنیا زیر زبر ہو گئی ساری، ایک coperNican revolution آگیا۔ پھر آپ دیکھیں نا اُس طرح کی میمز بنتی ہیں کہ وہ ابھی تک ضد کر رہے ہیں کہ زمین static ہے اور زمین مرکزِ کائنات ہے، وغیرہ وغیرہ کہ ہمارے بزرگوں نے فلاں رسالہ لکھا تھا، یہ لکھا تھا، وہ لکھا تھا۔ مطلب میری ناقص رائے میں colonizability میں بھی یہ بات شامل تھی کہ ہمارے اُس وقت کے بھی لوگوں کو شاید اس کا شعور نہیں تھا، مطلب مرہٹوں کا شعور اُن کو تھا لیکن انگریز یا یورپ کا شعور شاید اتنا نہیں تھا اور مطلب ہمارے اندر جیسے ایک inward lookingness تھی نا، وہ جیسے ایک بڑا آدمی ہوتا ہے، طاقت میں ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے بھئی ہم طاقت میں ہی رہیں گے، ہم تو نواب ہیں اور ہمیں کیا ضرورت ہے کہ جدید چیزیں سیکھنے کی؟ وہ تو جب colonize ہو گئے تو اندازہ ہوا۔ پھر چلیں ہم پر ایک جبر آیا اور لوگ کہتے تھے نا کہ علما کو جدید دنیا کا نہیں پتا، جدید علوم کا نہیں پتا لیکن اب تو کئی جگہوں پر ایسے لگتا ہے کہ اپنی تراث کا بھی شاید پورا علم نہیں ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ اب اِس کی طرف کوئی تھوڑی سی توجہ ہو رہی ہے، پہلے تو وہی بات ہے نا کہ ابنِ خلدون یا شاہ ولی اللہ دہلوی یا غزالی کوئی محض عالمِ دین تو نہیں تھے، وہ عالمِ دین و دنیا تھے۔ اس وقت کا جو عالمِ دین ہوتا تھا نا وہ اُس زمانے کا ہی polymath ہوتا تھا، امام غزالی علیہ الرحمۃ سے اُن کے زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی آ کے گفتگو کر سکتا تھا، کسی بھی علم کا، ابنِ خلدون کے ساتھ بھی ایسا تھا اور شاہ ولی اللہ صاحب تک بھی ایسا ہی تھا۔ اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ اب ہمارے ہاں علمیت جیسے بہت خاص ہو گئی اور segmentation ہو گئی بہر حال اُس کے اندر بھی ہمیں چاہیے یہ تھا کہ ہم اِن جدید چیزوں کو شامل کرتے۔ اب کیونکہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ مطلب جو جدید فکر ہے، جدید فلسفہ ہے اُس کو بھی دیکھا جائے اگرچہ ہیئت اب بھی پرانی بعض اوقات چل رہی ہوتی ہے، logic بھی پرانی چل رہی ہوتی ہے لیکن اب اِس کی ضرورت کا احساس بھی ہو رہا ہے اور لوگ کچھ کر بھی رہے ہیں لیکن شاید دیر کافی ہو گئی ہے، ڈینٹ بہت گہرا پڑ گیا ہے۔

جاری ہے

*****

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

# جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

قسط نمبر ۲

گزشتہ قسط میں آپ پڑھ چکے کہ عین اس موقعے پر جبکہ سلطان بایزید نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا تھا، بعض باغی امرا کے اکسانے پر، جو امیر تیمور سے بھاگ کر بایزید کے پاس پناہ لے چکے تھے، بایزید نے امیر تیمور سے جنگ مول لی، اور اب تک کی مسلسل فتوحات کے پیشِ نظر سلطان، امیر تیمور کی فوجی قوت، لشکرِ جرار اور امیر تیمور کی خونخواری کو خاطر میں نہ لایا اور اس کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکاری ہوا۔ دونوں کے درمیان جو خط کتابت کا سلسلہ رہا وہ انتہائی تلخ مکالموں پر مشتمل تھا۔ بالآخر تیمور نے بایزید کو سبق سکھانے کے لیے اپنی مہیب فوج اناطولیہ میں اتاری اور پہلا مقابلہ بایزید کے بیٹے ارطغرل سے ہوا۔ اگرچہ ارطغرل اور اس کے سپاہی بہت جم کر لڑے لیکن تیمور ایک عمدہ تدبیر کے ذریعے قلعے کی فصیلوں کو ڈھانے میں کامیاب ہو گیا۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا اور بے شمار سپاہی تہِ تیغ ہوئے۔ سلطان بایزید کا بیٹا ارطغرل بھی گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ اس پر بایزید نے انتقام لینے کی ٹھانی لیکن امیر تیمور اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ دو سال بعد پھر دونوں کے درمیان مکاتبت ہوئی اور وہی تلخ کلامی جاری رہی حتیٰ کہ اس جنگ کی نوبت آگئی جس میں عثمانیوں کو شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً اکثر مورخین اس جنگ کو بایزید کی غلطی قرار دیتے ہیں جس نے امیر تیمور جیسے عظیم الشان فرماں روا کو جنگ کے لیے للکارا۔ عثمانیوں کی شکست کے اگرچہ بہت سے اسباب تھے لیکن تین بنیادی اسباب یہ تھے: ۱) امیر تیمور کے لشکرِ جرار اور سلطان کی سوا لاکھ فوج میں عددی تفاوت۔ ۲) سلطان بایزید کا اپنے سپاہیوں اور سرداروں کے ساتھ ترش اور بخل پر مبنی رویہ جبکہ تیمور کا رویہ اپنے امرا و افواج کے

ساتھ نہایت فیاضانہ تھا۔ ۳) سلطان کے امرا اور سپاہیوں کا غدر اور عین جنگ کے وقت سلطان کو چھوڑ کر امیر تیمور سے مل جانا۔ ان تمام اسباب نے عثمانیوں کو بدترین شکست سے دوچار کیا۔ عثمانیوں کا قتلِ عام ہوا، تین شہزادے فرار ہونے میں کامیاب جبکہ ایک گرفتار ہوا۔ بایزید نے بھی بھاگنے کی کوشش کی لیکن گرفتار ہوا۔ امیر تیمور نے بایزید کے ساتھ انتہائی مشفقانہ برتاؤ کیا، اس کے لیے شاہی خیمہ لگوایا، اس کے بیٹے کو قیدیوں سے نکال کر بایزید کے پاس بھیج دیا۔ اسی طرح پایہ تخت سے سامان منتقل ہوا تو بایزید کی بیوی اور بیٹی کو بھی بایزید کے پاس پہنچا دیا، لیکن وہ بایزید جس نے بڑے بڑے محاذوں پر فتح کے جھنڈے گاڑے تھے اور جس کی شان و شوکت اور رعب و دبدبے سے یورپ کے شہنشاہ سراسیمہ رہتے تھے اس ذلت و رسوائی پر غم و الم کی تصویر بن گیا۔ تیمور نے بایزید کی بہت قدردانی کی اور اس کی بازنطینیوں کے خلاف فتوحات کو بہت سراہا حتیٰ کہ ایک موقعے پر یہ الفاظ بھی ادا کیے: ”اگرچہ احوالِ عالم تمام تر خداوند تعالیٰ کے ارادۂ قدرت کے مطابق پیش آتے ہیں اور کسی دوسرے کو حقیقتاً کوئی اختیار واقتدار حاصل نہیں ہے، تاہم انصاف اور حق یہ ہے کہ تم پر جو مصیبت آئی ہے، وہ خود تمھاری لائی ہوئی ہے۔ تم نے بارہا اپنی حد سے باہر قدم رکھا اور بالآخر مجھے انتقام پر مجبور کر دیا، پھر بھی چوں کہ تم اس دیار میں کفار سے جہاد کر رہے تھے، میں نے بہت کچھ تحمل کیا اور ان حالات میں جو فرض ایک خیر اندیش مسلمان کا تھا، اسے بجالایا۔ میری خواہش تھی کہ اگر تم فرماں برداری کی راہ اختیار کرو تو مال و لشکر کی جس قدر ضرورت تمھیں ہو اس سے تمھاری مدد کروں تاکہ تم اطمینان و قوت کے ساتھ جہاد میں مشغول رہ سکو اور دیارِ اسلام کے اطراف واکناف سے بے دینوں کے شرک کی شوکت کو فنا کر دو، لیکن تم نے سرکشی اور عناد اختیار کیا، حتیٰ کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا۔ سب جانتے ہیں کہ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور یہ قوت و غلبہ جو خداوند تعالیٰ نے مجھ کو بخشا ہے تم کو حاصل ہوتا تو اس وقت مجھ پر اور میرے لشکر پر کیا گزرتی، لیکن اس فتح کے شکرانے میں جو خدا کے فضل و عنایت سے مجھے حاصل ہوئی ہے، میں تمھارے اور تمھارے آدمیوں کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ نہ کروں گا، دل کو مطمئن رکھو“۔ (ظفر نامہ از مولانا شرف الدین علی نیروی، جلد: دوم، ص: ۴۳۸-۳۹، کلکتہ، ۱۸۸۸ء) بایزید کو اپنے فیصلوں پر شرمندگی بھی ہوئی اور اس نے غم کا اظہار بھی کیا لیکن پھر بھی ایک دن شاہی خیمے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ جب امیر تیمور کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے سخت پہرہ لگا دیا اور جب کبھی امیر تیمور سفر کرتا تو سلطان بایزید اس کے ساتھ ایک پالکی میں ہوتا۔ اس پالکی پر لوہے کی جالی

لگی ہوئی تھی جس سے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ امیر تیمور سلطان بایزید کو پنجرے میں بند کر کے اپنے ساتھ لیے لیے پھرتا ہے۔ بہر حال، یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ نہ رہی اور بایزید اس ذلت ورسوائی سے دل شکستہ ہو کر جان کی بازی ہار گیا۔ سلطان بایزید کی وفات سے سلطنتِ عثمانیہ بے آسرا ہو گئی اور کچھ عرصے تک طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ سلطان بایزید کی وفات کے بعد دس سال تک سلطنت ایک انتشار کا شکار رہی، قصرِ شاہی ویران رہا اور تخت بے رونق۔

## محمد خان چلبی (۱۳۸۶۔۱۴۲۱ء)

سلطان محمد خان چلبی بایزید کے چھوٹے بیٹے تھے جنھیں محمد اول بھی کہا جاتا ہے۔ محمد خان نے بڑے بڑے علما سے علم حاصل کیا اور ان کے زیرِ تربیت رہے۔ سلطان بایزید کو اپنے اس ہونہار بیٹے پر اتنا بھروسا تھا کہ کم سنی میں ہی آماسیہ کی گورنری اسے سونپ دی۔ نوجوان گورنر محمد خان چلبی نے بھی کبھی اپنے والد کو مایوس نہیں کیا اور اپنی بہترین حکمتِ عملی سے یہ ثابت کیا کہ سلطان بایزید کا فیصلہ درست تھا۔ وہ زمانہ جس میں سلطنتِ عثمانیہ کا مرکز معطل تھا، شہزادوں کی باہمی کشمکش کا شکار رہا، سلطان بایزید کے چاروں بیٹے اپنی سلطانی کا اعلان کر کے سلطنت کے مختلف خطوں پر قابض رہے اور ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ کبھی دو شہزادے مل کر دوسرے دو کے خلاف محاذ بناتے اور کبھی ایک شہزادہ دوسرے کے تخت کے درپے ہوتا۔ اس زمانے میں محمد خان نے بھی کئی جنگیں لڑیں اور اپنے بھائیوں کو شکست دی۔ بالآخر مقابلے میں شہزادہ محمد کو فتح ہوئی اور وہ تخت نشین ہوا۔ ۱۴۱۳ء میں چلپی محمد خان باقاعدہ اعلان کے ساتھ تختِ عثمانی پر جلوہ افروز ہوئے اور یوں سلطنتِ عثمانیہ کا یہ عارضی زوال ختم ہو گیا۔ محمد اول نے جس مہارت سے عثمانی سلطنت کو انتشار سے نکالا اور سلطنت کے دعوے داروں اور باغیوں کا قلع قمع کیا قابلِ تحسین ہے۔ محمد خان صرف عسکری امور میں ہی مہارت کے حامل نہیں تھے بلکہ علم و فضل میں بھی یکتا تھے۔ سیاسی بصیرت اور دور اندیشی انھیں اپنے اجداد سے وراثت میں ملی تھی۔ محمد خان چلبی کے سامنے سب سے بڑا محاذ یہ تھا کہ بایزید کی وفات کے بعد سلطنت جس شکست وریخت کا شکار ہوئی تھی اسے مربوط کیا جائے اور اس بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کیا جائے۔ گزشتہ دس سالوں کی کشمکش سے بہت سے خطوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ بازنطینی بھی از سرِ نو عثمانیوں پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ہر ایک کو یہ وہم تھا کہ اس دگرگوں صورتِ حال میں سلطنت کو توڑنا آسان ہو گا، لیکن

سلطان محمد خان چلبی عثمانیوں کے لیے مسیحا ثابت ہوئے جنھوں نے محض آٹھ سال کے عرصے میں نہ صرف دشمنوں کے دانت کھٹے کیے بلکہ وہ تمام علاقے جو عثمانیوں کے ہاتھ سے جاتے رہے تھے، انھیں پھر سے زیرِ نگیں کر لیا۔ اسی سبب سے انھیں دولتِ عثمانیہ کا موسسِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ محض سات سال میں سلطان محمد خان چلبی نے چوبیس جنگیں لڑیں۔ ان کے جسم پر کم و بیش چالیس گھاؤ اپنے آثار چھوڑ چکے تھے۔ سلطان کی یہ محنت رنگ لائی اور سلطنتِ عثمانیہ کو استحکام نصیب ہوا لیکن اس جُہدِ مسلسل نے سلطان کو بہت تھکا دیا اور بیمار کر دیا۔ مسلسل کی مشقتوں، اور بار بار کی جراحتوں نے سلطان کو بیمار کر دیا۔ علاج معالجے کے باوجود آپ کی بیماری طول پکڑتی گئی اور بالآخر ۱۴۲۱ء میں محمد خان اول خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ سلطان کی دولتِ عثمانیہ کے لیے خدمات غیر معمولی نوعیت کی ہیں۔ وہ بساط جو سلطان بایزید کی وفات کے بعد لپیٹ دی گئی تھی سلطان محمد خان نے چند سالوں میں اسے دوبارہ بھی بچھا دیا اور سلطنتِ عثمانیہ کے مردہ جسم میں جان ڈال دی۔ اگرچہ ان کا دورِ حکومت جنگوں میں گزر گیا لیکن سلطان کی توجہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود سے کبھی نہ ہٹی۔ اس مشکل گھڑی میں بھی سلطان نے ادرنہ کی جامع مسجد کو مکمل کی۔ بورصا میں ایک مسجد تعمیر کی، ایک مدرسہ اور مسافر خانہ بنایا۔ مورخین متفق ہیں کہ سلطان محمد خان اول ایک کریم النفس، زیرک، سخی اور علم پرور حاکم تھے۔ ان کی نظر تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی تھی۔ مردِ میدان تھے۔ ہمیشہ سر ہتھیلی پر لیے جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت سے سرشار رہتے تھے۔ محمد خان چلبی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مراد کو تخت کا وارث قرار دیا گیا۔ سلطان کی وفات کی خبر کچھ عرصہ مخفی رکھی گئی۔ سلطان کا جسدِ خاکی بورصا میں خود ان کے بنائے ہوئے مزار میں سپردِ خاک کیا گیا۔

جاری ہے

**کتابیات:**


السلاطين العثمانيون، راشد كوندوغدو، الناشر: دار الرموز للنشر، إسطنبول، ۲۰۱۸ء

آلبوم پادشاہانِ عثمانی، مترجم: میلاد سلمانی، ناشر: انتشاراتِ قَقْنُوس، استنبول، ۲۰۱۵ء

تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ، ڈاکٹر محمد عزیر، ناشر: کتاب میلہ، ۲۰۱۸ء


****

مولانا زاہد الراشدی زید مجدہ
معروف عالمِ دین اور اسلامی اسکالر

# حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہم سے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کچھ عرصہ قبل کراچی حاضری کے دوران ان کی بیمار پرسی کا موقع ملا تو والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کا آخری دور یاد آگیا، انھوں نے بھی ضعف و علالت کا خاصا عرصہ بسترِ علالت پر گزارا تھا اور میں ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ یہ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا و شَيْبَة کا اظہار ہے کہ جس بزرگ کے ساتھ ان کی جوانی کے دور میں پیدل چلنا بھی ہمارے لیے مشکل ہوتا تھا، آج وہ اپنے ہاتھ سے منہ میں لقمہ ڈالنے کی سکت نہیں رکھتے " رہے نام اللہ کا"۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ کر ماضی کے بہت سے مناظر ذہن میں تازہ ہوگئے اور تھوڑی دیر ان کے سامنے کھڑے رہ کر حسرت کے ساتھ وہاں سے نکل آیا، اب وہ اس مرحلہ سے بھی گزر گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند فرمائیں اور ان کے سب متعلقین کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے والد گرامی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع قدس اللہ سرہ العزیز کے فرزند و جانشین ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی علمی، دینی اور سیاسی روایات کے امین و پاسدار بھی تھے۔ اور ان کی مختلف النوع سرگرمیاں دیکھ کر حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہوجایا کرتی تھی۔ بڑے مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تو صرف زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا، یا والدِ گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ سے وقتاً فوقتاً ان کا تذکرہ سنتے رہتے تھے جو ان دونوں کے استاذِ

محترم تھے اور علمی و فقہی مسائل میں ان کا مرجع بھی تھے کہ کسی بھی ضرورت کے وقت وہ راہنمائی اور فتویٰ کے لیے ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔

البتہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ دامت فیوضہم کے ساتھ نیاز مندی کا تعلق عرصے سے چلا آرہا ہے، دونوں بزرگوں کی شفقتوں اور محبتوں سے فیض یاب ہوتا آرہا ہوں، بلکہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اندرونِ ملک بہت سی مجالس میں شرکت کے علاوہ امریکہ اور برطانیہ کے بعض اسفار میں بھی رفاقت رہی ہے جو میری زندگی کے بہترین ایام میں سے ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کے ذوق کا یہ پہلو میرے لیے ہمیشہ باعث توجہ رہا ہے کہ وہ علمی و دینی مجالس میں روایتی خطاب کی بجائے عوام اور علما دونوں کے لیے راہنمائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور اجاگر کرتے تھے جن میں سے بعض باتوں کا میں اپنے مختلف کالموں میں ذکر کر چکا ہوں۔ موقع و محل کے مطابق ضرورت کے امور کو محسوس کرنا اور اس کے مطابق راہنمائی کرنا ان کا خاص ذوق تھا جو یقیناً علمائے کرام کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ وہ تربیت و اصلاح کی طرف بطورِ خاص توجہ دیتے تھے اور جہاں اس حوالے سے کوئی کمی یا کوتاہی دیکھتے اسے نظر انداز کرنے کی بجائے اس کی نشاندہی کر کے اصلاح کی طرف متوجہ کرتے تھے۔

مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ متعلقہ امور میں مشورہ کرتے تھے اور مشورہ قبول بھی کرتے تھے اور حوصلہ افزائی کا معاملہ کرتے تھے۔ میں نے امریکہ کے ایک سفر میں ان سے گزارش کی کہ ہمیں اپنے فضلا اور منتہی طلبہ کو موجودہ عالمی فکری و تہذیبی ماحول سے روشناس کرانے اور آج کے علمی، فکری اور ثقافتی مسائل پر ان کی تیاری کرانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ بالخصوص بین الاقوامی قوانین و معاہدات اور ان کے عملی و تہذیبی اثرات سے انھیں آگاہ کرنا چاہیے جو ہمارے ہاں عام طور پر نہیں ہوتا۔ انھوں نے میری اس گزارش سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ مجھے دو تین بار اس بات کا موقع فراہم کیا کہ جامعہ دارالعلوم کراچی میں تخصص فی الدعوۃ والارشاد کے شرکا کے سامنے مختلف نشستوں میں اپنے ذوق کے مطابق عالمِ اسلام اور مغرب کی فکری و تہذیبی کشمکش کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ بیان کر سکوں۔

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ صاحبِ علم اور صاحبِ عمل تو تھے ہی، صاحبِ نسبت اور صاحبِ کردار بھی

تھے۔ نئی نسل بالخصوص نوجوان علمائے کرام کی ایسی جامع الاوصاف شخصیات سے شعوری ماحول میں وابستگی ہمارے دور کی اہم دینی ضروریات میں سے ہے، اور اس حوالے سے میری گزارش عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ بڑی شخصیات کے افکار و فیوض کو تحریری صورت میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ملاقاتوں اور مجالس کے ذریعے ان سے استفادہ زیادہ موثر اور نفع بخش ہوتا ہے اور نوجوان علمائے کرام کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ گوجرانوالہ میں ایک بار تشریف آوری کے موقعے پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ جامعہ نصرۃ العلوم اور الشریعہ اکادمی میں بھی رونق افروز ہوئے اور ”آج کی فکری اور تعلیمی ضروریات“ پر اکادمی کی نشست میں بہت پُر مغز گفتگو کی جو ہمارے لیے راہنمائی اور حوصلہ افزائی کا باعث بنی۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہم سے رخصت ہوگئے ہیں لیکن ان کی یادیں ان کی کمی کا احساس دلاتی رہیں گی۔ البتہ دل کو یہ تسلی ہے کہ ان کے بھائی اور ہم سب کے مخدوم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم ہمارے درمیان موجود ہیں جو نہ صرف اپنے ملک کے علمائے کرام اور دینی کارکنوں کے لیے رہبر و راہنما ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں پاکستان کی علمی پہچان اور اہلِ حق کی آبرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حضرت مفتی محمد رفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے فرزند مولانا محمد زبیر اشرف عثمانی اپنے والدِ گرامی کی تعلیمی اور اصلاحی جدوجہد کا تسلسل قائم رکھے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی قیادت میں جامعہ دارالعلوم کراچی کو اپنے علمی، فکری اور دینی سفر میں مسلسل پیش رفت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

نوٹ: یہ تحریر فیس بک وال سے کاپی کر کے شایع کی گئی۔

*****

مولانا بدر الحسن القاسمی

# حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا اور حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے تلامذہ کو اللہ تعالیٰ نے خاص طرح کے شرف و امتیاز سے نوازا ہے، اسلامی علوم و فنون میں مہارت اور علمی تحقیقی کاموں کا ذوق ہو یا رشد و ہدایت کے مراکز اور اصلاحِ قلب اور تزکیہ نفس کا میدان ہو، یہی لوگ سیاسی توڑ جوڑ اور منصب و اقتدار کے لیے مکر و فریب سے دور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی وراثت اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعبیر و تقسیم کے مطابق آپ کی باطنی خلافت کی ذمے داریوں کو پورے اخلاص کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ حضرت علامہ کشمیری کے نامور شاگردوں میں علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی اعظم محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ یہ سب اپنے زمانہ کے ممتاز عالم ہی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک مستقل ایک متحرک کتب خانہ اور دائرۂ علم کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری طرف حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بلند پایہ خلفا پر نظر ڈالیے تو وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ پر رشد و ہدایت کے مراکز اور اصلاح و تربیت کا نشان نظر آتے ہیں، وہ خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے وابستگان میں عقلا ہی رکھے ہیں اور ان کی حکمت مآب شخصیت نے علمائے کبار اور عقلائے روزگار کو ان کے گرد اکٹھا بھی کر لیا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ایک طرف فقہ و افتا میں حضرت کے معتمد خاص اور ساری دنیا کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت علامہ کشمیری کے علوم کا بھی وارث بنایا تھا اور

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سرچشمۂ رشد و ہدایت اور تربیت و تزکیۂ نفس کا نمائندہ بھی۔ وہ بلا شبہہ اکابر علمائے دیوبند کی خصوصیات کے وارث و امین تھے، ان کے اپنے ہاتھوں سے لکھے ہوئے ایک لاکھ سے زائد فتوے اور ان کی تالیف کردہ سیکڑوں اردو اور عربی کی کتابیں اور رسائل ان کی عظمت کی گواہ ہیں، ان کی اردو تفسیر "معارف القرآن" ہو یا عربی تفسیر "احکام القرآن" کے اجزا سبھی بے مثال ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان کو اولاد بھی ایسی عطا کی جو ایک سے بڑھ کر ایک باکمال اور علم و عمل سے آراستہ نظر آتی ہے، خاص طور پر ان کے دو صاحب زادے: حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی کو اللہ رب العزت نے ایسا علمی مقام عطا فرمایا اور ایسا عملی امتیاز بخشا جس کی نظیر برصغیر ہی نہیں عالم اسلام میں بھی مشکل سے مل سکتی ہے، آج جبکہ حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اپنے جانِ آفریں، خالقِ حقیقی کی آغوشِ رحمت میں پہنچ گئے ہیں تو یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۳۵۵ھ، مطابق: ۱۹۳۹ء کو دیوبند میں ہوئی تھی، باپ کا نام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے رکھا تھا اور بیٹے کا نام حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہم اللہ نے۔

دار العلوم میں زیرِ تعلیم ہی تھے کہ اپنے والد ماجد اور اہلِ خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ تقسیمِ ہند کے بعد کراچی پہنچ گئے، اساتذۂ کرام میں خود مفتی محمد شفیع صاحب، مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب، مولانا سبحان محمود صاحب اور مولانا سلیم اللہ خان صاحب جیسے باکمال رہے، علمی استفادہ علامہ ظفر احمد عثمانی اور علامہ محمد یوسف بنوری سے بھی کیا اور دیگر اہل علم سے بھی اور اپنے والد بزرگوار کی ہدایت پر اصلاحی تعلق حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی رحمۃ اللہ علیہم سے قائم کیا اور اس طرح شیخ کی ہدایت کی پابندی کی کہ تقریروں سے روکا گیا تو دس سال تک تقریر سے باز رہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا کہ جس پر ساری دنیا آج رشک کرتی نظر آتی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کی شخصیت بڑی خوبیوں کی حامل تھی، آپ ایک بلند پایہ اور بالغ نظر فقیہ اور مفتی تھے، ہزاروں فتوے آپ کی یادگار ہیں، آپ کو حدیث اور دیگر علوم سے بھی بھرپور مناسبت تھی، آپ نے "عصرِ رسالت میں کتابتِ حدیث" پر گراں قدر رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ صحیح مسلم شریف کے درس کا خلاصہ یا اس کی مختصر اردو شرح بڑے شگفتہ انداز پر تحریر فرمائی ہے؛ جس کی ۲/ جلدیں انھوں نے مکہ مکرمہ کی ملاقات کے دوران عطا کی تھیں، علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق کتاب "فتح الملہم" پر عربی زبان میں تعلیقات بھی تحریر

فرمائی ہیں، فقہی کتابوں کے ضمن میں آپ نے علامہ ابنِ عابدین کی ''شرح عقود رسم المفتی'' پر بھی عربی زبان میں تعلیقات اور حواشی قلم بند کیے ہیں۔ ''المقالات الفقہیہ'' کے نام سے عربی زبان میں ان کے تحقیقی مقالات دو جلدوں میں شایع شدہ ہیں، ان کے چند عربی زبان کے مختصر رسائل کانفرنس کے لیے لکھے گئے تھے جن میں سے ''الأخذ بالرخص، بيع الوفاء، ضابط المفطرات، الصوم في المذاهب الأربعة'' بین الاقوامی فقہ اکیڈمی جدہ کی طرف سے شائع کیے گئے ہیں۔ اردو کتابوں میں کتابت حدیث کے علاوہ ''تین معاشی نظام''، ''نوادر الفقہ''، ''احکامِ زکوٰۃ''، ''جناب مفتیٔ اعظم اور میرے مرشد حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ ''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ صحیح امام مسلم اور بعض دوسری حدیث کی کتابیں وہ ہمیشہ پڑھاتے رہے ہیں اور روایتی تعلیم کے علاوہ ان کو اپنے والد ماجد، مولانا ظفر احمد عثمانی، شیخ حسن المشاط مکی، مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب سے روایت حدیث کی خصوصی اجازت بھی حاصل تھی۔

حضرت مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات تو دار العلوم کراچی میں اس وقت ہوئی تھی جبکہ میں لیبیا کے سفر سے ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب کے ساتھ کراچی آیا تھا، دار العلوم کراچی میں ہی حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی صاحب سے ملاقات ہوئی پھر مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی معیت میں ان کی بعض مجلسوں میں حاضری کی بھی سعادت حاصل ہوئی اور عارفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی شخصیت کا گہرا نقش دل پر قائم ہوا۔

آج حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کے انتقال کے حادثے پر اسی طرح کا احساس ہو رہا ہے، جس کا اظہار حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نے ان کے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے انتقال پر دار العلوم دیوبند کے ''نودرے'' میں اساتذہ اور طلبہ کے سامنے اپنے تعزیتی بیان میں کیا تھا۔ مفتی صاحب اور حضرت حکیم الاسلام کی تعلیم کا زمانہ تقریبًا ایک ہی تھا اور دونوں ہی اکابر کے علوم کے امین اور علم و فضل کی دنیا کے بے تاج بادشاہ رہے اور ایک عالم ان کی صداقت و امانت اور نفاست کا گرویدہ رہا ہے، ایک ''فتویٰ'' کی شان اور وقار تھے تو دوسرے کو خطابت اور حکمت بیانی کی بے مثال قدرت حاصل تھی اور دونوں میں سے کسی کی نظیر ان کے ہم عصروں میں سے پیش نہیں کی جاسکتی، یہ رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد اسی طرح آج حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کا جانا بھی عجیب المناک حادثہ محسوس ہوتا

ہے۔ حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اپنے علم وفضل کے ساتھ ساتھ غیر معمولی اخلاقی عظمت اور قائدانہ اوصاف و خصوصیات کے حامل انسان تھے، بہت جلد گھل مل جانے والے، تواضع کے پیکر اور دنیا کے احوال پر گہری نظر اور زیر بحث مسائل پر واضح اور دوٹوک رائے رکھتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں "فتویٰ" سے متعلق عالمی کانفرنس رابطہ عالمی اسلامی نے منعقد کی تو حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا تقی عثمانی دونوں ہی موجود تھے اور افتتاحی اجلاس میں شرکاے کانفرنس کی طرف سے نمائندگی مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے ہی کی، اس اجلاس میں مکہ کے گورنر شاہزادہ خالد الفیصل بھی موجود تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کی وفات کا سانحہ میرے نزدیک اس لحاظ سے بھی نہایت المناک ہے وہ اکابر دیوبند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ شبیر احمد عثمانی اور علامہ انور شاہ کشمیری کے ذہن و مزاج سے قریب اور شرعی نصوص کی ان کی بیان کردہ تشریح سے اپنے نامور برادرِ خورد کے ساتھ پورے طور پر آگاہ تھے، ان کا مزاج اپنے والد بزرگوار کی تربیت، حضرت تھانوی کے افادات پر عبور اور مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا ظفر احمد عثمانی کی کتابوں سے شغف اور حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی کیمیا اثر نظر اور عملی تربیت نے ایسا بنا دیا تھا کہ اس میں فکری ناہمواری کے در آنے کی کہیں سے گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی؛ چنانچہ دونوں ہی ایک اکائی کی طرح اکابر کے علم، کتاب و سنت کی روح اور علماے دیوبند کے ذوق و مزاج اور صحیح مسلک کے محافظ اور امین بن گئے تھے، اب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کی ذات تنہا رہ گئی ہے۔

چند سال پہلے جب مولانا تقی عثمانی صاحب ہندوستان آئے اور دار العلوم دیوبند میں ان کے لیے استقبالیہ جلسہ کا اہتمام کیا گیا تو دار العلوم کے مدرس مولانا ریاست علی بجنوری صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے جو بات کہی تھی، اس کا ایک جملہ یہ بھی تھا کہ پہلے زمانے میں دار العلوم کا مسلک جاننے کے لیے لوگ یہاں آتے تھے اور اکابر دار العلوم سے رجوع کرتے تھے؛ لیکن آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ دار العلوم دیوبند کا صحیح مسلک جاننے کے لیے ہمیں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب سے رجوع ہونے کی ضرورت ہے، جملہ اسی مفہوم کا تھا جو مجلہ "البلاغ" بھی میں شائع ہوا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ قریبی عہد کے بعض اساتذہ نے دار العلوم کے مسلک کو مشتبہ کر کے رکھ دیا ہے اور اپنی مزاجی بے اعتدالی اور ذہنی

تہور اور کم علمی کی وجہ سے ایسے ایسے دعوے صحیح بخاری اور سنن ترمذی کے اسباق میں کرڈالے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

ابھی چند سال پہلے بعض خلیجی ملکوں میں اپنا اثرو رسوخ بڑھانے اور پٹرو ڈالر کو اپنی جماعت تک محدود رکھنے کے لیے برصغیر میں چھوٹا سا ایک ایسا گروہ سرگرم ہوگیا جس کی خاصیت ہی بدگمانی اور بدزبانی ہے، فقہاے کرام کو نشانہ بنانے کے بعد اکابر علماے دیوبند سے عرب نوجوانوں کو ان کی ناواقفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بدظن کرنے کی مہم شرع کردی اور اسلم پاکستانی کے رسالے میں جس فتنے کی بنیاد ڈالی گئی تھی، اب کبھی "القول البليغ في جماعة التبليغ" اور کبھی "الديوبندية" کے نام سے اس کو ہوا دینے کی کوشش زور وقوت سے شروع ہوگئی۔

حضرت شیخ الہند پر قرآنی آیت میں تحریف کا الزام، علامہ انور شاہ کشمیری کو نئے مدرس قرار دے کر ان پر تعصب کا الزام اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کی "عبقات" جو خالص کشفی علوم، وحدۃ الوجو اور وحدۃ الشہود کے موضوع پر ہے اس کو "مجددانہ کارنامہ" کتاب پڑھے اور سمجھے بغیر ہی قرار دے ڈالا۔ اس زمانے میں غلط فہمیوں کے ازالے اور غلط بیانیوں کے تدارک کے لیے میں نے ایک چھوٹا سا عربی رسالہ "وجہ جدید" کے نام سے لکھا تھا، تو بڑا سوال یہی سامنے تھا کہ "دیوبندیت" کیا ہے؟ اور مسلک دیوبند کی حدودِ اربعہ کی تعیین کس طرح کی جائے؟ اور اس میں مرجعیت کس کو حاصل ہے؟ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ بے حد قیمتی ہے؛ لیکن وہ مناظرانہ انداز کا ہے۔ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کی کتاب مسلک کے معتدل ہونے کے بیان میں بے مثال ہے؛ لیکن فکری اور اعتقادی الرجی میں مبتلا گروہ کی شفایابی اس کے ذریعے شاید ممکن نہ ہو، بالآخر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اکابرِ دیوبند کے فتاویٰ کے جو مجموعے شایع شدہ ہیں، ان میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے لے کر حضرت الاستاذ مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تک کے فتاوے ہی سند کی حیثیت رکھتے ہیں، ورنہ خوابوں کے مجموعے اور کرامات کی بھول بھلیوں میں ارشد القادری کے "زلزلہ" کا سارا مواد موجود ہے۔

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مرحوم اور مولانا محمد تقی عثمانی کی شخصیت ایک اکائی طرح تھی، ان دونوں نے اپنے والد گرامی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی علمی و ذہنی تربیت اور حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحب کی روحانی تاثیر کے ساتھ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف کو جس طرح ہضم کیا ہے کہ ان کا مزاج ایک خاص سانچہ میں ڈھلا ہو، معلوم ہوتا ہے؛ جس میں فکری بے اعتدالی کی گنجائش ہے اور نہ مسلکی رجحان میں کتاب و سنت کی تعلیمات اور حضور اکرم ﷺ کی سیرت کے جلووں سے دوری کا امکان، جس نے ان کو صحیح مسلک کا چلتا پھرتا ترجمان بنادیا تھا، نہ تو اس وقت صحیح مسلک کی باریکیوں کا ادراک کرنے والا اور نہ بالغ نظری سے ان کی تشریح کرنے والا کوئی اور ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و ائمۂ دین، فقہائے مسلمین رحمہم اللہ کا یا جمہور اہلِ سنت کا جو مسلک ہے، علمائے دیوبند اسی پر قائم اور اسی کے محافظ ہیں اور اسلام، ایمان اور احسان کے تقاضوں پر مضبوطی سے قائم ہیں اور ہر طرح کی بدعت اور فکری انحراف کے شدت سے مخالف۔ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اور مولانا محمد تقی عثمانی دونوں بھائیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت کی تعمیر کی طرف حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی خاص توجہ رہی۔ دینی علوم کا سرمایہ تو خود اپنے گھر میں موجود تھا، پھر بھی اچھے اساتذہ سے تعلق، تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی خاص نظر، پھر خود اپنی تربیت میں رکھنے کے بجائے حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی سے اصلاحی تعلق قائم کرانا بھی حضرت مفتی صاحب کی حکیمانہ تدبیر تھی کہ باپ کی شفقت شاید اس درجہ کی نگرانی میں رکاوٹ ہو، اس لیے دوسرے ولیِ کامل کی مدد لی جائے اور انھوں نے بھی ان کو مانجھنے اور سنوارنے کا روحانی فریضہ پوری توجہ سے انجام دیا۔ ذرا سے خدشے کی بنیاد پر شہرت و مقبولیت کے باوجود تقریر کرنے پر مکمل پابندی لگادی جو دس سال تک جاری رہی اور دونوں بھائیوں نے اسے نہ صرف گوارہ کیا؛ بلکہ مکمل پابندی کی مثال قائم کردی۔ ایسی شخصیت جس کی فقہی بصیرت اور علمی قابلیت کا لوہا عالمِ اسلام کے علمی مراکز اور فقہی اکیڈمیاں مان رہی ہوں وہ اپنے شیخ کی ہر ہدایت کو بے چوں چرا تسلیم کرنے میں کوئی حرج محسوس نہ کرے، اسے خود ہی ولایت کا اعلیٰ مقام قرار دیا جاسکتا ہے۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کے شاگرد اور فیض یافتگان دنیا کے ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، انھوں نے بھی دنیا کے بہت سے ممالک دیکھے ہیں۔

انھوں نے دار العلوم کے انتظام و انصرام کا کام بھی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر انجام دیا ہے، دار العلوم کی عمارت جس سلیقے سے تعمیر کی گئی ہے، درس گاہوں اور خاص طور پر دار الحدیث کا جو نظام رکھا گیا ہے، دیوبند کا دار العلوم تو "پدرم سلطان بود" کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے؛ لیکن دار العلوم کراچی کے یہ ذمے داران بنفسِ نفیس موجودہ زمانے کے پیچیدہ مسائل کا حل

پیش کرنے میں عرب علما سے آگے ہیں۔ "تکملہ فتح الملہم"، "فقہ البیوع"، "المدونۃ الجامعۃ" یہ سارے علمی کارنامے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے ہیں۔ مالی معاملات کے لیے شرعی معیار کی تدوین کا ادارہ دسیوں سال سے مولانا کی صدارت میں کام کررہاہے، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کے وجود سے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کو بھی بڑی حد تک یکسوئی تھی۔

موجودہ زمانے میں کس طرح کے عالم دین کی ضرورت ہے، اس سوال کا اب تک ایک ہی جواب ہے کہ موجودہ زمانہ کے عالم دین میں مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی کی علمی اور عملی خصوصیات ہونی چاہییں، اب تک اس کی کوئی دوسری مثال خال خال ہی پیش کی جاسکتی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اور مولانا محمد تقی عثمانی اپنے علمی کمالات اور بعض مزاجی خصوصیات میں فرق کے باوجود ساری زندگی دو قالب ایک جان کی طرح رہے، باہم عظمت اور شفقت نے ایسا توازن پیدا کردیا تھا کہ وفات کے حادثے پر مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی زبان سے اپنے ایک بازو کے علاحدہ ہوجانے کا اظہار اس طرح ہوا کہ "طالبِ علمی کے زمانے سے ہم ساتھ رہے، آج پچھتر سال کا ساتھ یکدم چھوٹ گیا"۔

اللہ تعالیٰ مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب کو فردوس میں جگہ دے اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے دست و بازو کو مضبوط کرے اور انھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے، ان سبھوں کا علمی فیض ہمیشہ قائم ودائم رکھے۔ مولانا کو بلاشبہہ یہ کہنے کا حق ہے کہ:

وكنا كندمانَيْ جذيمة حقبة     من الدهر حتى قيل لن يتصدعا

فلما تفرقنا كأني و مالكا     لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

(یعنی ہم دونوں جذیمہ کے دونوں ہمنشینوں کی طرح ایک مدتِ دراز تک زمانے سے جدا نہیں ہوئے، یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ یہ دونوں تو کبھی جدا نہیں ہوں گے، لیکن جب ہم دونوں یعنی میں اور مالک ایک دوسرے سے جدا ہوئے، تو طویل زمانے تک ساتھ رہنے کے باوجود گویا ایک رات کے لیے بھی یکجانہ ہوئے ہوں)

نوٹ: یہ تحریر فیس بک وال سے کاپی کی گئی اور بعد از اختصار شایع کی گئی۔

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

# بیت المقدس کا تاریخی خاکہ

قسط نمبر ۱۸

جنگِ قرم (کریمین) میں اگرچہ سلطنتِ عثمانیہ کو فتح نصیب ہوئی لیکن اس موقعے پر سلطنت مقروض ہوگئی تھی۔ سلطان عبدالحمید ثانی کی تخت نشینی سے ایک سال قبل یعنی ۱۸۷۵ء میں سلطنتِ عثمانیہ دیوالیہ ہوچکی تھی اور اسے "یورپ کا مردِ بیمار" کا لقب دیا جاچکا تھا۔ اب یورپی طاقتیں اس بندۂ بیمار کی آخری رسومات ادا کرنے کی جلدی میں تھیں۔ چناں چہ اپنے دور حکومت کے شروع ہی میں سلطان کو روس کی جارحانہ جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں ترکی کو شکست ہوئی یہاں تک کہ ادرنہ شہر پر روسی فوجوں نے قبضہ کرلیا، جس پر سلطنت نے صلح کی درخواست کی جس کے نتیجے میں ۱۸۷۸ء میں سان اسفتانوس معاہدہ ہوا جس میں سلطنت عثمانیہ کو نہ صرف بہت سے مقبوضات سے پیچھے ہٹنا پڑا بلکہ کثیر مالی تاوان ادا کرنا پڑا۔ ان حالات نے یہودیوں اور عثمانی دشمن قوتوں کے حوصلے بڑھادیے اور وہ اپنے منصوبوں پر عمل کرنے میں زیادہ مستعد ہوگئے۔

## سیاسی و سفارتی کوششیں

اسی عرصے میں یہود کی آباد کاری کے لیے سیاسی و سفارتی کوششوں میں تیزی لائی گئی۔ برطانوی مصنف اور دانشور لارنس اولیفانٹ نے ۱۸۷۸ء میں فلسطین میں اراضی خرید کر یہاں یہودی زرعی گاؤں بسانا چاہا۔ اس نے برطانوی وزیر اعظم بنجمن ڈسرائیلی، دفترِ خارجہ اور فلسطین میں برطانوی سفیر کے تعاون سے ایک خطۂ زمین پسند کیا۔ پھر ۱۸۷۹ء میں اس منصوبے

کے ساتھ استنبول روانہ ہو گیا جہاں استنبول میں برطانوی سفیر ہنری لائرڈ کے تعاون سے کئی سرکردہ روشن خیال لوگوں سے ملاقات کی اور اپنے منصوبے کی تفصیلات اور سلطنت کو حاصل ہونے والے فوائد بتا کر ان کی رائے اس منصوبے کے حق میں بنانے کی کوشش کی۔ اس نے کابینہ سے ملاقات کے علاوہ سلطان سے بھی ملاقات کی۔ اس نے سلطنت کے فرانسیسی جنگی مشیر کرنل دریسی( Dreyesse) سے بھی سفارش کرائی لیکن خلیفہ نے نہ صرف انکار کیا بلکہ اسے استنبول سے چلے جانے کا حکم دیا اور آئندہ داخلے پر پابندی لگادی۔ ۱۸۸۱ء میں شاہ روس الیگزینڈر ثانی کے دورِ حکومت میں روس کے بعض علاقوں میں یہودیوں نے سرکشی کی توان کی خوب گوش مالی کی گئی۔ اس موقعے پر یہودیوں نے سلطان عبدالحمید سے فلسطین کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت طلب کی لیکن سلطان نے سختی سے منع کر دیا۔ البتہ انھیں پیشکش کی کہ وہ سلطنت کے کسی دوسرے حصے میں آباد ہونا چاہیں تو انھیں اجازت دی جا سکتی ہے لیکن یہودی فلسطین میں آباد کاری پر مصر تھے۔ چناں چہ سلطان نے صاف انکار کر دیا۔ ۱۸۸۲ء میں روسی یہودیوں کا ایک وفد اوڈیسیا کے عثمانی سفارتخانے میں پہنچا اور فلسطین میں قیام کی اجازت طلب کی۔ سلطان کی طرف سے ایک فرمان سفارت خانے کو بھیجا گیا جس میں اپنے سابقہ موقف کا اعادہ کیا گیا، اس کے ساتھ ہی قدس کی جانب ایک حکم نامہ جاری کیا گیا جس میں بیرونی یہودیوں کو یہاں قیام کی ممانعت کی گئی۔ جون ۱۸۸۲ء میں چودہ روسی یہودیوں کا ایک گروہ استنبول کی سیر کو آیا اور یہاں سے اس نے فلسطین کا رخ کیا، اس ارادے سے کہ وہیں قیام پذیر ہو جائے گا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے اداروں کو پتا چلا تو سلطان نے قدس کے امیر کو برقی تار بھیجا کہ جس دن وہ گروہِ یہودی یہاں پہنچے اسے یہاں اترنے نہ دیا جائے بلکہ اپنی حدود سے نکال دیا جائے۔ ۱۸۹۱ء میں میں یورپی طاقتوں کا ایک وفد استنبول پہنچا اور اس نے امورِ خارجہ کے وزیر محمد سعید پاشا صغیر کے ذریعے سلطان عبدالحمید سے رابطہ کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم یہودیوں کو قدس میں آباد نہیں کر سکتے۔ اگر ان کی آباد کاری اتنی ہی ضروری ہے تو انھیں امریکا میں بسایا جائے۔ اور اگر کوئی گروہ یہود ہماری اجازت کے بغیر یہاں داخل ہوا تو ہم اسے فوری طور پر بے دخل کریں گے۔

### تھیوڈور ہرزل کی کوششیں

تھیوڈور ہرزل آسٹریا ہنگری کا ایک یہودی قانون دان، مصنف و دانشور اور عالمی صیہونی تنظیم کا صدر تھا۔ اسے ریاستِ

اسرائیل کا روحانی باپ قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے جرمن بینکار، بارن موریس دی ہیرش سے مل کر عارضی طور پر یہود کو ارجنٹینا میں آباد کرنے کی سکیم بنائی۔ اگرچہ کچھ لوگ یہاں ہجرت کر گئے لیکن یہود میں یہ منصوبہ عام پذیرائی نہ حاصل کر سکا۔ ۱۸۹۶ء میں تھیوڈور ہرزل نے اپنی کتاب The Jewish State شایع کی جس میں اس نے تمام یہودی مسائل کا حل فلسطین میں قومی ریاست کے قیام سے مشروط کیا۔ اس نے یہ کتاب سر کردہ یہودیوں اور بطور خاص روتھ شیلڈ خاندان کو بھیج کر قومی ریاست کے قیام کے مقصد کے لیے کام کرنے پر آمادہ کیا۔

ترکی مغربی طاقتوں کا مقروض تھا۔ عالمی صیہونی تنظیم کے سربراہ تھیوڈور ہرزل نے انہی قرضوں کے ذریعے ترکی کو دباؤ میں لانے کا فیصلہ کیا۔ ہرزل نے اپنے ایک دوست نیولنسکی سے رابطہ کیا جو آسٹریا کی طرف سے استنبول میں سفیر رہ چکا تھا۔ یہاں سلطان کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ بعد میں نیولنسکی نے پیرس اور ویانا سے ایک اخبار نکالنا شروع کیا تھا۔ ہرزل نے اس سے کہا کہ اگر عثمانی سلطنت فلسطین ہمارے حوالے کر دیتی ہے تو ہم نہ صرف اس کے قرضے ادا کر دیں گے بلکہ فلسطین کی زمین کی قیمت کے بدلے اور بھی بہت کچھ ادا کریں گے اور ہمارے درمیان واسطہ بننے والے کو بھی کثیر مال عطا کریں گے۔ چناں چہ ۱۸۹۶ء میں بلغراد کے عثمانی سفیر توفیق پاشا کے ذریعے نیولنسکی نے سلطان سے رابطہ کر کے قسطنطنیہ کا دورہ کیا۔ اس سفر میں ہرزل بھی شامل تھا لیکن اسے سلطان کی طرف سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ نیولنسکی نے ہی ہرزل کا پیغام سلطان تک پہنچایا۔ اس نے سلطان کو پیشکش کی کہ اگر یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے تو ان کی طرف سے سلطنت کا تمام قرضہ ادا کر دیا جائے گا نیز فلسطین کے بدلے مزید دولت بھی پیش کی جائے گی۔ سلطان نے اس ساری اسکیم کو ناپسند کیا اور نیولنسکی سے سوال کیا کہ کیا یہود کو اپنے وطن کے لیے فلسطین کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ملتی۔ نیولنسکی نے جواب دیا: فلسطین یہودیوں کا اولین وطن ہے اس لیے وہ وہیں جانا پسند کرتے ہیں۔ سلطان نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا: ''فلسطین صرف یہودیوں کا وطن نہیں ہے بلکہ یہ تمام ادیان کا مقدس علاقہ ہے۔ سلطان نے نیولنسکی سے کہا دیکھو جس طرح تم میرے دوست ہو اگر اسی طرح ہرزل تمھارا دوست ہے تو تم اسے یہ نصیحت کر دو کہ اس معاملے میں جو قدم اٹھا چکا؛ اٹھا چکا، اب دوسرا قدم نہ اٹھائے۔ میں اس ارضِ مقدس کا ایک چپّا بھی نہیں

بیچ سکتا۔ یہ میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے یہ میری ملکیت ہی نہیں بلکہ یہ تو میری امت کی ملکیت ہے۔ میرے اسلاف نے اس زمین کو جنگ کر کے حاصل کیا ہے اور خون دے کر دشمنوں سے اس کی حفاظت کی، ہم نے اس زمین کو اپنا خون پلایا ہے اور ہم اس زمین کی حفاظت کے لیے اب بھی خون دے سکتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں جنگ بلفینا میں ہمارے فوجیوں نے عزت سے شہید ہو جانا پسند کیا، انھوں نے موت کو خوش آمدید کہا لیکن جیتے جی اپنا شہر، روسیوں کے حوالے نہیں کیا۔ یہود کو یاد رکھنا چاہیے جب تک میری حکومت قائم ہے وہ فلسطین حاصل نہیں کر سکتے۔ جب تک ہمارا ملک قائم ہے، ہمارے جسموں میں جان باقی ہے اور میں قید حیات میں ہوں وہ فلسطین کسی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتے"۔

۱۸۹۷ء میں ترک یونان جنگ کے موقعے پر جب کہ سلطنتِ عثمانیہ شدید مالی بحران کا شکار تھی ہرزل نے ویانا کے سفیر کے ہاتھ بہت ساری رقم سلطان کی خدمت میں ارسال کی لیکن سلطان نے اسے ٹھکرا دیا۔ اسی سال بازل سوئزر لینڈ میں ایک صیہونی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں ہرزل نے کہا کہ فلسطین میں یہودی سلطنت کے قیام کی دو صورتیں ہیں یا تو عثمانی سلطان ہماری پیش کش قبول کر لے یا پھر سلطنتِ عثمانیہ کو توڑ دیا جائے اور اب یہی کرنا پڑے گا۔

ہرزل کو معلوم ہوا کہ شاہِ جرمنی ولیم ثانی جو یورپ میں سلطنتِ عثمانیہ کا اتحادی تھا اور ولیم کے ساتھ سلطان عبد الحمید کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ استنبول کے دورے پر روانہ ہو رہا ہے۔ اس نے ولیم سے درخواست کی کہ وہ اسے ساتھ لے چلے۔ چناں چہ وہ ۱۸۹۹ء میں شاہِ جرمنی کے ساتھ استنبول آ گیا لیکن یہ مہم بھی ناکام ثابت ہوئی۔ سلطان کی طرف سے ہرزل کو ملاقات کا شرف نہیں بخشا گیا۔ البتہ اس کے بعد ایک موقعے پر سلطان نے اسے ملاقات کی اجازت دی۔ دو گھنٹے کی اس ملاقات میں زیادہ تر ہرزل ہی بولتا رہا۔ سلطان نے تحمل سے ہرزل کی ہرزہ سرائی سنی لیکن اپنے سابقہ موقف پر قائم رہے۔ ۱۳ مئی ۱۹۰۱ء کو بھی ہرزل کی سلطان کے ساتھ ایک بے نتیجہ ملاقات ہوئی۔ ۱۸/ مئی ۱۹۰۱ء کو عثمانی شہری اور یہودی ربی موشے لیوی کے توسط سے ایک ملاقات ہوئی۔ اس میں ہرزل نے سلطان کو مالی خدمت کے ساتھ انجمن اتحاد و ترقی کے اخباری حملوں کو رکوانے میں اپنا کردار ادا کرنے کی یقین دہانی کرائی اور یہودیوں کی آباد کاری کے متعلق اپنی درخواست از سرِ نو پیش کی۔ سلطان نے جواب دیا: "میرا تو خیال ہے کہ تم لوگ دنیا بھر میں امن و امان سے رہتے ہو اور ہماری سلطنت

میں توتم زیادہ خوش حال ہو، کیا یہاں تمھارے ساتھ کوئی ظلم و زیادتی ہوئی کہ تم قومی ریاست بنانے کے درپے ہو"۔ سلطان غصے میں تھے۔ موشے لیوی یہ دیکھ کر استغفار پڑھتے ہوئے سلطان سے معافیاں مانگنے لگا۔ سلطان نے فرمایا: "ہم نے تم لوگوں کا عام لوگوں سے بڑھ کر خیال رکھا، تم دوسروں سے زیادہ خوشحال اور آرام دہ ہو اور اتنا زیادہ کہ دنیا کے دوسرے علاقوں میں پہنچنے والے عذاب کو بھول بیٹھے ہو۔ فلسطین ہمارے اجداد نے خون دے کر حاصل کیا اور خون دے کر اس کی حفاظت کی۔ تمھیں یہاں وطن بنانے کی قطعی اجازت نہیں ہے"۔

فروری ۱۹۰۲ میں ہرزل نے استنبول کا ایک مزید سفر کیا جس میں سلطان سے ملاقات تو نہ ہوئی لیکن چند وزیروں سے ملاقات ہوئی جس میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ چنانچہ ہرزل نے مایوس ہو کر اپنے کسی اجلاس میں یہ بیان دیا: "میری تمام امیدیں دم توڑ چکی ہیں جب تک سلطان عبدالحمید تخت سنبھالے ہوئے ہے ہم فلسطین میں داخل نہیں ہو سکتے"۔ اس کے بعد ہرزل نے برطانوی وزیر چیمبرلین، یہودی سرمایہ دار لارڈ روتھ شیلڈ سے ملاقاتیں کی اور حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چیمبرلین نے یہودیوں کو یوگنڈا میں آباد کرنے کی تجویز دی جو اس نے رد کی۔ پھر اس نے ویٹی کن سٹی کا دورہ کیا اور پوپ کی حمایت حاصل کی۔ اس نے اطالیہ کے حکمرانوں وغیرہ سے ملاقاتیں کیں اور یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کے لیے ان کی مدد حاصل کی۔ یہودیوں نے امریکی وزیرِ مملکت آسکر سولومن ستراوس Oscar Solomon Straus کے ذریعے سے بھی سلطان کو یہودی آباد کاری پہ رضامند کرنے کی ناکام کوشش کی۔

## فلسطین کے متعلق قانون سازی

سلطان عبدالحمید خان ثانی نے فلسطین میں یہودی آباد کاری کو روکنے کے لیے مختلف اوقات میں قانون جاری کیے۔ ۱۹۸۱ء میں ایک قانون جاری کیا گیا جس میں یہودیوں کو عثمانی شہری بن کر اور ملکی قوانین کے تحت پوری سلطنت میں کہیں بھی قیام پذیر ہونے کی اجازت دی گئی البتہ قدس میں قیام کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں سلطان عبدالحمید نے ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے یہود کو زمین بیچنے کی ممانعت کی گئی۔ اس قانون میں یہ بھی قرار دیا گیا کہ دوسرے اجنبیوں کو زمین بیچنے کے لیے سلطنت کی منظوری ضروری ہے۔ ۱۸۸۴ء میں انھوں نے یہودی زائرین کے قیام کی مدت کی تحدید کرتے ہوئے

انھیں تین مہینے رہنے کی اجازت دی جو پہلے چھے مہینے تھی۔ البتہ یہودی تاجروں کو فلسطین میں داخلے کی ممانعت کر دی گئی۔ ۱۸۹۲ء میں یہودی زائرین کے قیامِ قدس کی مدت تین ماہ سے کم کر کے ایک مہینا کر دی گئی۔ ۱۸۹۸ء میں سلطان نے ایک قانون جاری کیا جس میں کسی یہودی کو فلسطین کی شہریت دینے کی ممانعت کی گئی نیز یہودی زائرین کے قیامِ قدس کے لیے تین دن کی میعاد مقرر کی گئی۔ ان کے لیے ایک مالی ضمانت بھی مقرر کی گئی کہ واپسی تک اتنی رقم بطور ضمانت رکھوائیں گے جو بعد میں ختم کر دی گئی۔ اس قانون سازی سے یہودی آباد کاری پر خاصی حد تک رکاوٹ رہی۔ البتہ رشوت و سفارش اور مکر و حیلے سے محدود پیمانے پر یہودی آباد کاری کا سلسلہ جاری رہا۔ یورپی سفارت خانوں خاص کر برطانوی سفیر نے کئی یہودیوں کو عیسائیوں کے نام اور جعلی کاغذات سے زمین خرید کر یہاں آباد کروایا۔

## آباد کاری کی چند کوششیں

موسی حائم مونٹی فوری (Moses Haim Montefiore) یہودی سرمایہ دار، بینکار اور سیاست دان تھا جسے برطانیہ نے سر کا خطاب دیا تھا۔ اس نے کئی بار قدس کی زیارت کی۔ ۱۸۳۶ء کے زلزلے کے بعد اس نے قدس کے بعض علاقوں یافا وغیرہ میں ریلیف کا کام کیا۔ اس نے ۱۸۵۵ء میں یافا کے باہر ایک باغ قائم کیا اور یہود کو زراعت کی تربیت دینے لگا۔ اس نے ۱۸۶۰ء میں بیت المقدس شہر کی فصیل کے باہر ایک رہائشی رقبہ قائم کیا جس میں غریب یہودیوں کو آباد کرنا شروع کیا۔ ۱۸۹۱ء میں جرمن صیہونی لیڈر پال فریڈمان نے شاہِ مصر خدیو عباس حلمی کو شیشے میں اتار لیا اور ایک لاکھ ستر ہزار جرمن مارک اور پچیس ہزار پونڈ سٹرلنگ کے عوض صحرائے سینا میں طورِ سینا کی طرف ایک خطۂ اراضی حاصل کر لیا۔ سلطان عبد الحمید نے ایک فوج بھیج کر ان صیہونیوں کو یہاں سے بے دخل کیا اور یہ علاقہ مصر سے واپس لے لیا۔ ۱۸۹۸ء میں جرمنی نے جبلِ صیہون پر کچھ زمین اتحادی ہونے کی آڑ میں ہتھیالی اور یہاں ''کنواری مریم'' کے نام سے گرجا قائم کیا گیا۔ اگرچہ یہ عیسائی ادارے تھے لیکن درپردہ یہاں یہودیوں کو ٹھکانا فراہم کیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں کچھ یہود نے فلسطین میں بسنے کی کوشش کی اور یہودی زرعی فارم ہاؤس دغانیا کے نام سے بنایا گیا۔ اس کے لیے سرمایہ فراہم کرنے والا موشے دیان تھا۔ اس کے بعد بھی فارم ہاؤس بنانے کا سلسلہ جاری رہا۔ زرعی فارم اقتصادی کے علاوہ یہودیوں کا سیاسی اور ملی مرکز ہوتا تھا۔ پہلے اسرائلی

وزیر اعظم بن گوریان اور شمعون پیرز کے علاوہ بہت سارے اسرائیلی وزرا اپنے اپنے وقت میں ان فارم ہاؤسز کا حصہ رہے ہیں۔ ان سب کوششوں کے باوجود، ایک منظم حکومت کی موجودگی میں فلسطین پر قبضہ یا بڑی تعداد میں وہاں ہجرت کر جانا، یہودیوں کے لیے ممکن نہ تھا۔

جاری ہے

## کتابیات


السلطان عبد الحميد و هرتزل، دكتور بها الأمير

الدولة العُثمانية – عَوَامل النهُوض وأسباب السُّقوط، عَلي محمد الصَّلاَّبي

القدس و المسجد الأقصى عبر التاريخ، دكتور محمد على البار

المفصل في تاريخ القدس، عارف العارف

أسرار انقلاب عثماني، مصطفى طوران


*****

مفتی نذیر احمد ہاشمی مد ظلہ
ضبط و ترتیب: مولانا عابد علی

# القواعد الفقھیۃ

## القاعدة السادسة: إِذَا تَعَارَضَ الْمَانِعُ وَالْمُقْتَضِي، يُقَدَّمُ الْمَانِعُ

### جب مانع اور مقتضی میں تعارض ہو تو مانع کو تقدم حاصل ہوگا

## تشریح

کسی ایک ہی کام کے سلسلے میں دو باتیں اس طرح ٹکرا جائیں کہ ایک بات اس کام سے روکتی ہو اور دوسری بات اس کا تقاضا کرتی ہو تو روکنے والی بات کو اہمیت دی جائے گی، اگر کسی اور دلیل سے کام کرنے والی بات کی تائید ہو جائے تو پھر اس کی اہمیت بڑھ جائے گی۔

قاعدے کی بنیاد: اس قاعدے کی بنیاد اس حدیثِ نبوی ﷺ پر ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: «ما نَهَيْتُكم عَنْه فَاجْتَنِبُوا وما أَمَرْتُكُم بِهِ فَاتُوا منه مَا اسْتَطَعْتُمْ» ”جس کام سے میں تمھیں منع کروں تو اس سے رک جاؤ اور جس کام کا تمھیں حکم دوں تو استطاعت بھر اس کو بجا لاؤ“۔ حدیثِ مذکورہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شارع کی نظر میں کام کرنے والے حکم کے مقابلے میں کسی کام سے روکنے کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ دو باتیں ہیں کہ کام سے منع کرنے والی بات کا ذکر پہلے کیا گیا اور کام کرنے والی کا بعد میں، دوسری بات یہ کہ کرنے والے کاموں کے ساتھ استطاعت بھر کی شرط لگا دی یعنی استطاعت سے باہر ہو تو کرنے والے کاموں کی بھی پابندی نہیں رہتی۔

## مثالیں

۱۔ آج کل کے زمانے میں خواتین کو جماعت کی نماز میں شرکت کے لیے مساجد جانے سے منع کر دینا اسی قاعدے کے پیشِ

نظر ہے۔ اس لیے کہ فسادِ زمانہ منع کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ نیز حدیث: «لا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللهِ مَسَاجِدَ اللهِ» ”اللہ کی بندیوں کو مسجد میں جانے سے مت روکو“۔ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خواتین مساجد میں جاکر باجماعت نماز ادا کریں۔ لیکن روکنے والی بات کو ترجیح دے کر خواتین کو باجماعت نماز مسجد میں پڑھنے سے روکا جائے گا۔

۲۔ اگر ذبح شدہ جانور اور مردار کی کھالیں آپس میں مل جائیں اور جدائی کی کوئی علامت نہ ہو اور غلبہ مردار کا ہو، یا دونوں برابر ہوں، تو ان میں سے کسی کا استعمال کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ ذبح شدہ جانور کی کھال استعمال کرنا جائز ہے اور مردار کی کھال استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ اس مسئلے میں قاعدے کی رعایت کرتے ہوئے حرام کو حلال پر ترجیح حاصل ہوگی اور کسی کھال کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۳۔ ہر مالک کو اپنی ملکیت میں موجود چیز کو استعمال کرنے میں آزادی ہے، مگر جب اس چیز میں کسی اور کا حق بھی آجائے تو پھر مالک کو اس چیز پر ہر طرح سے تصرف کرنے سے روک دیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص کسی گھر کی نیچے والی منزل کا مالک اور دوسرا اوپر والی منزل کا مالک ہے دونوں کو اپنی ملکیت میں گھر کا ایسا استعمال کرنے سے روکا جائے گا جس سے دوسرے کا حق متاثر ہو رہا ہو۔ مگر ملکیت میں چیز ہونے کی وجہ سے اس کو اپنی چیز کا ہر طرح سے استعمال کرنا جائز ہونا چاہیے، مگر مذکورہ قاعدے کے تحت اس کو اپنی چیز کے ہر طرح استعمال کرنے سے روکا جائے گا۔

۴۔ عدالت میں کوئی شخص گواہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس گواہ کو بعض لوگوں نے اچھا آدمی قرار دیا اور بعض لوگوں نے اس کی گواہی نہ قبول کرنے کا کہا۔ اس قاعدے کی بنیاد پر جب گواہی قبول کرنے اور گواہی قبول نہ کرنے والے دونوں پہلو پائے گئے تو گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

۵۔ اگر کوئی قرض وقت پر ادا نہ کرے تو شریعت کی رو سے اسے قید کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی بیٹا اپنے باپ کو قرض دے اور وہ وقت پر ادا نہ کر سکے تو اس کو قید نہیں کیا جائے گا، کیونکہ قرض ادا نہ کرنے کی وجہ، باپ کو قید کرنے کا تقاضا کرتی ہے، مگر باپ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ساتھ احسان اور صلہ رحمی کی جائے اور اسے قید نہ کیا جائے۔

****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

# خریداری کے بدلے میں ملنے والے واؤچرز کا حکم

سوال: مجھے سود کے حوالے سے ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے۔ میرا تعلق بحرین سے ہے۔ یہاں بڑے بڑے شاپنگ مالز میں یہ آفر ہوتی ہے کہ اگر آپ بیس دینار تک کی کوئی چیز خریدتے ہیں تو وہ آپ کو پانچ دینار کے واؤچرز دیتے ہیں، جسے خریداری کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ پانچ دینار سود کے زمرے میں آتے ہیں؟

جواب: کسی بھی شاپنگ مال میں ایک خاص مقدار تک مال کی خریداری کرنے پر گاہک کو کوئی چیز یا واؤچر انعام میں دینادر حقیقت دکان دار کی طرف سے گاہک کے لیے خصوصی رعایت ہے۔ جس کو مقرر کردہ قیمت میں کمی کرنا کہا جائے گا، یہ سود کے حکم میں داخل نہیں، اس میں کوئی اور خلافِ شرع بات شامل نہ ہو تو اس طرح خریداری کرنا جائز ہے۔

وأما الإبراء المضاف إلى الثمن فصحيح ولو بهبة أو حط فيرجع المشتري بما دفع على ما ذكره السرخسي فليتأمل عند الفتوى بحر

وذكر السرخسي أن الإبراء المضاف إلى الثمن بعد الاستيفاء صحيح، حتى يجب على البائع رد ما قبض، وسوى بين الإبراء والهبة والحط فيتأمل عند الفتوى اهـ(الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (۱۵٦/۵)

۲۸ نومبر ۲۰۲۲ء

فتوی نمبر: ۵۸٦۷

*****

سفرنامہ: مفتی اویس پاشا قرنی

ضبط و ترتیب: مولانا محمد اقبال

# افغان نامہ

## قسط نمبر ۵

### شاعرِ مشرق اور افغانستان

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال مرحوم نے اپنی شاعری میں افغانستان کا جس انداز میں تذکرہ کیا ہے، اس سے ان کی افغانستان کے ساتھ والہانہ محبت اور وہاں کی تاریخی شخصیات سے عقیدت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ علامہ مرحوم نے جا بہ جا اپنی شاعری میں افغانستان کے مسلم فاتحین اور سلاطین کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ آپ افغان قوم کے جذبۂ حریت سے بہت متاثر تھے اور ان کی سامراج دشمنی کے مداح رہے۔ محمود غزنوی، خوشحال خان خٹک، احمد شاہ ابدالی، حکیم سنائی اور سید جمال الدین افغانی جیسی شخصیات کی جدوجہد اور فکر سے آپ بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت افغانستان کے نظامِ تعلیم اور خصوصی طور پر کابل یونیورسٹی کے تعلیمی پروگرام کے سلسلے میں مشاورت کی غرض سے تھی، جس کی روداد مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے "سیرِ افغانستان" میں بیان کی ہے۔ جبکہ علامہ اقبال نے اس سفر کی رُوداد مثنوی "مسافر" میں بیان کی ہے۔ اسی طرح "زندہ رود" میں فرزندِ علامہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے مختلف مأخذات سے اس سفر کے اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ دورانِ سفر ان تینوں حضرات کی معاونت کے لیے بیرسٹر غلام رسول خان اور ڈاکٹر مہدی حسن ساتھ تھے۔ یہ وفد براستہ پشاور، کابل پہنچا اور قندھار سے ہوتا ہوا چمن، کوئٹہ کے راستے واپس ہوا۔

تذکرتاً ایک مناسبت عرض کرتا چلوں کہ جب ہم اپنے سفر افغانستان سے واپس لوٹے تو ''زندہ رود'' میں علامہ کی اس ترتیبِ سفر کو پڑھ کر خوشی ہوئی کہ لگ بھگ ایک صدی قبل افغانستان میں نادر شاہ کی قائم کردہ نئی حکومت جو ملی جذبات سے سرشار تھی، کی نصرت کے لیے علامہ نے جس ملک کا سفر فرمایا، آج ہم فقیروں کو بھی ایک نئی اسلامی امارت کے قیام کے بعد بغرض نصرت انہی راہوں پر چلنا نصیب ہوا۔ اس فرق کے ساتھ کہ ہم نے سفر کا آغاز کوئٹہ براستہ چمن بارڈر، اسپین بولدک اور قندھار سے کیا اور غزنی سے ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ قیام کابل کے بعد جلال آباد سے گزرتے ہوئے براستہ طورخم پشاور پہنچے۔ یعنی دونوں اسفار کے مابین عکسی نسبت ہے۔

علامہ اقبال نے وہاں کی مختلف تعلیمی، سیاسی اور ادبی نشستوں میں شرکت کی اور اپنے احساسات و تاثرات کا اظہار کیا۔ علامہ مرحوم نے افغانستان کے اس سفر میں اپنے تاثرات کو منظوم انداز میں پیش فرمایا اور واپسی پر فارسی مثنوی ''مسافر'' میں افغانستان کے اس سفر کے تقریباً دو ہفتوں کے مشاہدات و تاثرات بیان کیے۔ مثنوی ''مسافر'' میں اقبال نے افغانیوں کو خود شناسی، بیداری، نظم و نسق، ترقی، باہمی اتحاد و اتفاق اور اپنے بادشاہ نادر شاہ کی قیادت پر اعتماد کا پیغام دیا۔ اس سفر میں علامہ مرحوم نے غزنی، قندھار کی سیر بھی کی اور سلطان محمود غزنوی، احمد شاہ ابدالی اور حکیم سنائی جیسی شخصیات کے مزارات پر حاضری بھی دی، اس کی روداد فارسی کلام میں موجود ہے۔ علامہ کے سفر سے واپسی پر ایک اندوہناک واقعہ یہ پیش آیا کہ اسی ہفتے افغانستان کے فرمان روا نادر شاہ کی شہادت کی خبر آئی، علامہ مرحوم نے اپنے تاثرات میں نادر شاہ شہید کا ذکر یوں فرمایا:

مسافر وارد می شود بہ شہر کابل و حاضر می شود بحضور اعلیٰ حضرت شہید

مسافر (اقبال) کابل شہر میں داخل ہوتا ہے اور اعلیٰ حضرت شہید کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے

شہرِ کابل خطۂ جنت نظیر     آبِ حیواں از رگِ تاکش بگیر

چشمِ صائب از سوادش سرمہ چیں     روشن و پایندہ باد آں سرزمین

در ظلامِ شب سمن زارش نگر     بر بساطِ سبزہ می غلطد سحر

آں دیارِ خوش سواد، آں پاک بوم
بادِ او خوشتر ز بادِ شام و روم

آبِ او براق و خاکش تابناک
زندہ از موجِ نسیمش، مردہ خاک

ناید اندر حرف و صوت اسرارِ او
آفتاباں خفتہ در کہسارِ او

ساکنانش سیر چشم و خوش گہر
مثلِ تیغ از جوہرِ خود بے خبر

قصرِ سلطانی کہ نامش دلکشاست
زائراں را گردِ راہش کیمیاست

شاہ را دیدم در آں کاخِ بلند
پیشِ سلطانے فقیرے دردمند

خُلقِ او اقلیمِ دل ہا را کشود
رسم و آئینِ ملوک آنجا نبود

من حضورِ آں شہِ والا گہر
بے نوا مردے بہ دربارِ عمر

جانم از سوزِ کلامش در گداز
دستِ او بوسیدم از راہِ نیاز

پادشاہے خوشِ کلام و سادہ پوش
سخت کوش و نرم خوے و گرم جوش

صدق و اخلاص از نگاہش آشکار
دین و دولت از وجودش استوار

خاکی و از نوریاں پاکیزہ تر
از مقامِ فقر و شاہی باخبر

در نگاہش روزگارِ شرق و غرب
حکمتِ او رازدارِ شرق و غرب

ترجمہ: کابل شہر جنت کی مانند ہے، اس کی انگور کی بیل سے آبِ حیات حاصل کر۔ مشہور شاعر صائبؔ تبریزی کی آنکھیں کابل کی سیاہی سے سرمہ حاصل کرنے والی ہیں، اللہ تعالیٰ اس سرزمین کو پائندہ و تابندہ رکھے۔ رات کی تاریکی میں اس کے چنبیلی کے باغ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سبزے کے قالین پر صبح نمودار ہو رہی ہے۔ وہ ایک خوش منظر، اچھا علاقہ اور صاف ستھری سرزمین ہے، اس کی ہوا شام اور روم سے کہیں بہتر ہے۔ اس کا پانی شفاف اور مٹی تابناک ہے، اس کی بادِ نسیم سے مردہ خاک زندہ ہو جاتی ہے۔ اس کے اسرار؛ الفاظ اور آواز کی گرفت میں نہیں آسکتے، اس کے کوہساروں میں کئی سورج سوئے ہوئے ہیں۔ اس کے باشندے سیر چشم اور شریف النفس ہیں، لیکن تلوار کی طرح اپنے جوہر سے بے خبر ہیں۔ شاہی

محل جس کا نام دلکُشا ہے، اس کے راستے کی گرد دیکھنے والوں کے لیے کیمیا ہے۔ میں نے اس عالی شان محل میں بادشاہ سے ملاقات کی، یہ ملاقات سلطان سے ایک دردمند فقیر کی تھی۔ سلطان کے اخلاق دلوں کی سلطنت کو فتح کرنے والے تھے، وہاں بادشاہوں کے سے رسوم و آداب اور تکلفات نہیں تھے۔ میں اس بلند کردار کے حامل بادشاہ کے سامنے ایسا ہی تھا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دربار میں کوئی بے نوا شخص ہو۔ میری روح اس کی باتوں کی گرمی سے پگھل گئی اور میں نے نیاز مندی کے طور پر اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ وہ ایک شیریں کلام، سادہ لباس پہننے والا، جفاکش، نرم مزاج اور محبت سے ملنے والا بادشاہ تھا۔ اس کی نگاہ سے سچائی اور اخلاص جھلکتے تھے، اس کا وجود دین اور سلطنت کے استحکام کا باعث تھا۔ تھا تو وہ خاک کا پتلا مگر فرشتوں سے بھی زیادہ پاکیزہ فطرت کا مالک تھا، وہ فقر اور سلطنت کے مقام و مرتبے سے باخبر تھا۔ اس کی نگاہوں میں مشرق اور مغرب کا زمانہ تھا۔ اس کی دانائی مشرق اور مغرب دونوں کی سیاست کے راز جانتی تھی۔

علامہ اقبال جانتے تھے کہ افغانیوں کی دینی غیرت اور جذبۂ جہاد ''مُلّا'' کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے خیال میں یہ دینِ حق کی محبت اور اس پر اعتماد تھا جس نے افغان ملت کو باطل کے سامنے ڈٹ جانے پر مجبور کیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایشیا کی کوئی قوم سامراج کا مقابلہ نہیں کر سکی، جبکہ افغانستان کے بے سروسامان باشندوں نے یہاں سامراج کو شکست سے دوچار کیا اور غلامی سے محفوظ رہے۔ علامہ اقبال کو کیا معلوم تھا کہ یہ افغان ملت جس نے ابھی صرف ٹیڈی برطانوی نوآبادیاتی سپر پاور کو شکست دی ہے، اس کے بعد یہ گرم پانیوں کی تلاش میں آئے سرخ ریچھ اور نوسرمایہ دارانہ سامراج امریکہ کانے کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرے گی۔

بہر حال! یہاں افغان ملت کی مدح اور عقیدت کے متعلق کلام اقبال کے چند نمونے پیش خدمت ہیں: اقبالؔ نے ''ضربِ کلیم'' میں ایک نظم ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' درج کی ہے:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا　　　رُوحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج　　　مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

ایک نظم میں اقبالؔ نے محراب گل افغان کی زبان سے افغان قوم کو انتہائی دلنشین انداز میں پیغام دیا ہے کہ روم، شام

اور ہندوستان کے باشندے بیداری کی راہ پر چل پڑے ہیں، لہذا اے افغان! تم بھی اپنی خودی پہچان لو اور بیداری کی راہ پر گامزن ہو جاؤ جیسے تمھارے آباواجداد نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ افغان قوم کو احساس دلاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ تمھیں قدرت نے کیا کیا صلاحتیں عنایت کر رکھی ہیں، لہذا ان صلاحیتوں کو پہچانو اور ان کو بروئے کار لاتے ہوئے تم بھی غریبی و ناداری کی زندگی سے نکل کر دنیا کی دوسری قوموں کی طرح جاگ جاؤ۔ ترقی کے میدان میں اس شرط پر آگے بڑھیں کہ اہلِ مغرب کی پیروی میں اپنا قومی وقار اور تہذیبی شناخت ضائع نہ ہو۔

محراب گل افغان کے افکار

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان　　　تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان، او غافل افغان

موسم اچھا پانی وافر مٹی بھی زرخیز　　　جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان، او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا　　　جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان، او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ　　　اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان

اپنی خودی پہچان، او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج　　　عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان

اپنی خودی پہچان، او غافل افغان

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے نزدیک افغانستان کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ ان کے حسبِ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:

آسیا یک پیکرِ آب و گل است　　　ملتِ افغاں در آں پیکر دل است

از فسادِ او فسادِ آسیا　　　در کشادِ او کشادِ آسیا

تا دل آزاد است آزاد است تن          ورنہ کاہی در رہ باد است تن

ترجمہ: برِاعظم ایشیا ایک پیکرِ آب و گل کی مانند ہے جبکہ مِلت افغان اس جسم میں دل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا فساد برِاعظم ایشیا کے فساد کا باعث ہے اور اس کی کشاد یعنی جب اس کی گرہ کھل جاتی ہے تو ایشیا کی گرہ کھل سکتی ہے۔ جب تک دل آزاد رہتا ہے جسم آزاد رہتا ہے ورنہ جسم ہوا کے راستے میں ایک تنکا ثابت ہوتا ہے۔

اسی سفر میں اقبالؔ نے کابل میں سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر بادشاہ کے مزار پر حاضری دی اور اس موقعے کی مناسبت سے ایک نظم لکھی۔ اس میں انھوں نے فرمایا کہ بابر ایک آزاد ملک میں دفن ہیں اور یہ ان کی خوش نصیبی ہے:

بر مزارِ شہنشاہ بابر خلد آشیانی

جنت میں مقام رکھنے والے شہنشاہ بابر کے مزار پر

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید ایں جا          کہ ایں زمیں زطلسمِ فرنگ آزاد است

ہزار مرتبہ کابل نکوتر از دلی است          کہ آں عجوزہ عروس ہزار داماد است

ترجمہ: تو کیسا خوش نصیب ہے کہ تیرا جسدِ خاکی اس سرزمین میں آرام کر رہا ہے اور یہ سرزمینِ کابل انگریز کے طلسم سے محفوظ ہے۔ کابل دلی سے ہزار مرتبہ بہتر ہے کیونکہ یہ بڑھیا ہزاروں شوہروں کی دلہن بنی ہے۔

اقبالؔ نے غزنی میں حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا ہے:

سفر بہ غزنی و زیارت مزار حکیم سنائی

غزنی کا سفر اور حکیم سنائی کے مزار کی زیارت

آہ غزنی آں حریمِ علم و فن          مرغزارِ شیرِ مردانِ کہن

دولتِ محمود را زیبا عروس          از حنا بندانِ او دانائے طوس

خفتہ در خاکش حکیمِ غزنوی          از نوائے او دلِ مرداں قوی

آں حکیمِ غیب، آں صاحب مقام          ترک جوش رومی از ذکرش تمام

ترجمہ: افسوس وہ غزنی جو کبھی علم و فن کا گہوارہ اور پرانے شیر مردوں کا مرغزار تھا۔ جو محمود غزنوی کی سلطنت کے لیے حسین دلہن تھی۔ جس دلہن کے ہاتھوں پر مہندی لگانے والوں میں سے ایک دانا 'طوس' سے بھی تھا۔ اس کی خاک میں حکیم غزنوی جیسا شخص سویا ہوا ہے، وہ ایسی شخصیت ہے کہ جس کے ترانے سے بہادروں کے دل اور بھی قوی ہوتے ہیں۔ وہ حکیمِ غیب، بلند مقام کا حامل جس کے ذکر سے مولائے روم کا جوش و خروش کمال کو پہنچا۔

علامہ اقبال نے کئی مواقع پر اپنے فارسی اور اردو کلام میں افغانستان کا تذکرہ کیا ہے، ہم نے یہاں چند اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کیے ہیں، جبکہ بعض آگے سفرنامے میں مختلف مواقع کی مناسبت سے ان شاء اللہ ذکر ہوتے رہیں گے۔

جاری ہے

## کتابیات


الكامل في التاريخ (لابن الأثير)

افغانستان د تاریخ په رڼا کی (استاد احمد علی کهزاد)

افغانستان د معاصر تاریخ په رڼا کی (شهسوار سنگر وال)

له احمد شاه بابا سره تر حامد کرزی

د افغانستان تاریخ له اصحابانو ترطالبانو(حانواک مفتی زاده)

د افغانستان پر معاصر تاریخ یوه لنډه کتنه (ڈاکٹر ابراہیم عطائی)

سیرِ افغانستان (مولانا سید سلیمان ندوی)

تاریخِ افغانستان (مولانا اسماعیل ریحان)


* * * * *